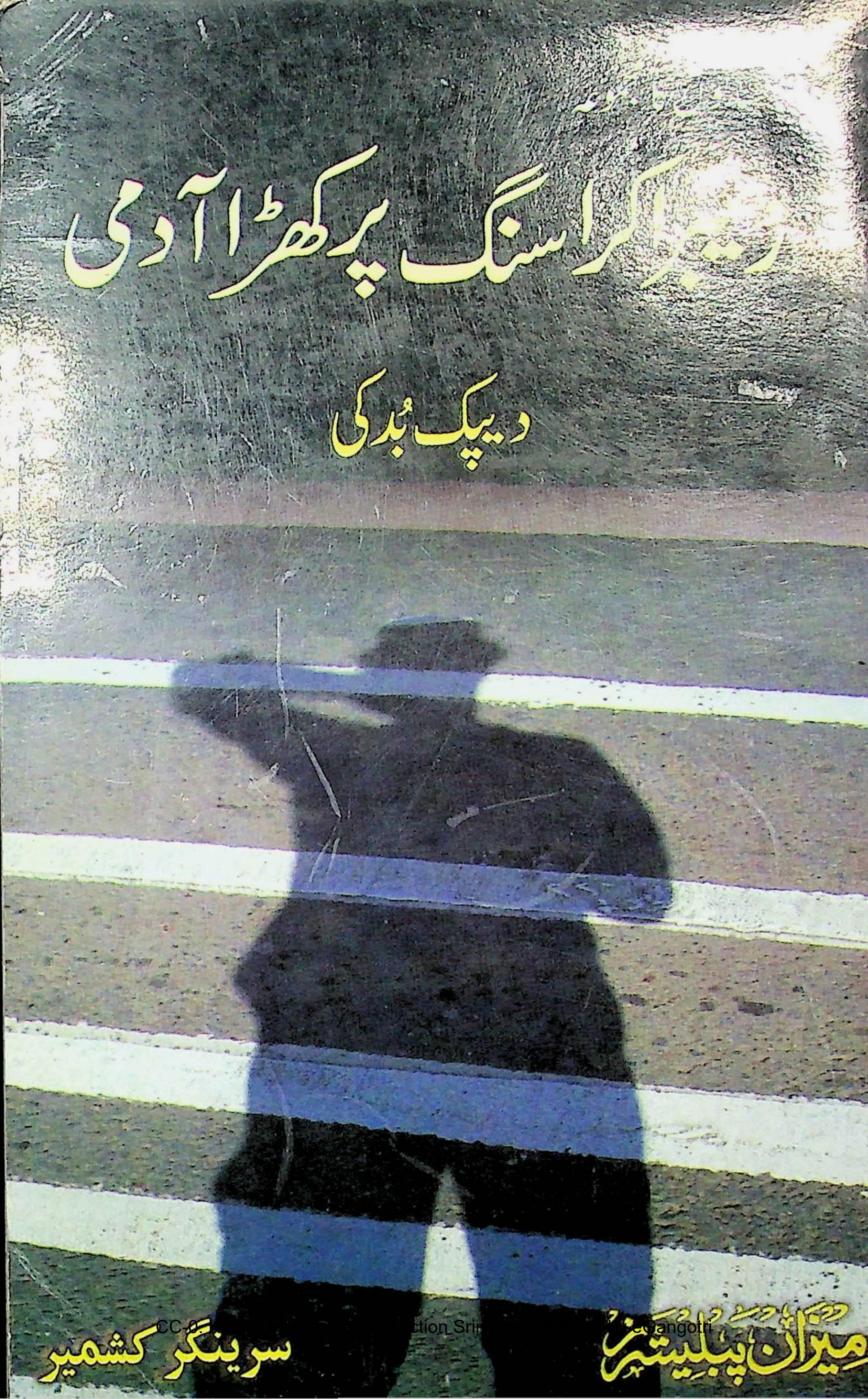
# زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

## دیپک بُدکی





میزان پبلیشرز
سرینگر کشمیر

# زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

(افسانے)

دیپک بُدکی


**میزان پبلشرز**

بالمقابل فائیر برگیڈ ھیڈ کوارٹرز، بٹہ مالو

سرینگر۔ کشمیر 190001

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (افسانوی مجموعہ) |
| مصنف | : | دیپک بُدکی |
| قیمت | : | دوسو پچاس روپے (Rs 250/-) |
| | : | بیرون ملک: پندرہ ڈالر ($ 15) |
| اشاعت | : | پہلا ایڈیشن ستمبر ۲۰۰۷ء |
| ناشر | : | میزان پبلشرز، بالمقابل فائیر برگیڈ ہیڈکوارٹرز، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر 190001 |
| کمپیوٹر کمپوزنگ | : | وسیم احمد و نسیم اختر |
| مطبع | : | میزان پرنٹرز، سرینگر |




---

Zebra Crossing Pe Khada Aadmi

(A Collection of Short Stories)


**Author** : **Deepak Budki**

**Price** : Inland Rs 250/- Foreign : $15/-

**Publisher** : Meezan Publishers
Opp: Fire Service Headquarters
Batamaloo, Srinagar- Kashmir 190001

**Tel** : (O) 0194-2470851 Mob: 9419002212

# انتساب

صبر و تحمّل کے پیکر

اپنے پِتا جی

آنجہانی رادھا کرشن بُدکی

کے نام

# تحریر ظهری

اس مجموعه کے سبھی کردار، مقامات
اور واقعات فرضی هیں۔ کسی شخص،
مقام یا واقعه سے کوئی مناسبت محض
اتفاق هوسکتا هے جس کے لئے مصنف یا
ناشر پر کوئی ذمه داری عائد نهیں
هوگی۔

# سپاس نامہ

میں ان سب مدیر حضرات کا احسان مند ہوں جنہوں نے اس مجموعہ میں شامل افسانے اپنے گراں قدر رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع کیے اور قارئین تک پہنچائے۔ یہ افسانے جن رسالوں میں چھپ چکے ہیں ان کے نام لکھنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

ادھوری کہانی (آج کل نئی دہلی جولائی ۲۰۰۴ء، چہار سو راولپنڈی ستمبر اکتوبر ۲۰۰۴ء)، گھونسلا (شاعر ممبئی ستمبر ۲۰۰۴ء، صدا کشمیر مئی۔ جولائی ۲۰۰۶ء)، پہاڑوں کا رومانس (بیسویں صدی نئی دہلی مارچ ۲۰۰۵ء)، معصوم علی (کتاب نما دہلی جنوری ۲۰۰۴ء، خوشبو کا سفر حیدر آباد ۲۰۰۶ء)، کئی گاندھی اور (بیباک مالیگاؤں فروری ۲۰۰۷ء) ایک دو اور تین (جدید فکر و فن شملہ اپریل جون ۲۰۰۴ء، تکمیل بھیونڈی، جولائی دسمبر ۲۰۰۵ء)، سرحدیں (چہار سو راولپنڈی مئی جون ۲۰۰۶ء)، ایوان اردو دہلی مئی ۲۰۰۷ء، شاعر ممبئی مئی ۲۰۰۷ء)، دوگز زمین (سبق اُردو جولائی دسمبر ۲۰۰۶ء)، گھر کا بیدی (بہار پٹنہ بعنوان آستین کا سانپ مارچ ۲۰۰۵ء، شعر و سخن مانسہرا پاکستان)، چڑی کی بیگم (امکان لکھنؤ مارچ ۲۰۰۴ء، ادبی کارواں ناگپور اپریل۔ جون ۲۰۰۵ء)، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (شاعر ممبئی ستمبر ۲۰۰۴ء)، اداس لمحوں کا کرب (انتساب شمارہ ۶۲)، مغرور لڑکی (شاندار اعظم گڑھ اپریل ۲۰۰۴ تا جون ۲۰۰۵ء)، شیر اور بکرا (ادب لطیف لاہور اکتوبر ۲۰۰۵ء، شاعر ممبئی دسمبر ۲۰۰۵ء، کائنات کولکتہ جون ۲۰۰۵ء)، منقولہ خواب (زبان و ادب پٹنہ اکتوبر ۲۰۰۵ء)، آواز کا جادو (جدید فکر و فن شملہ جنوری مارچ ۲۰۰۵ء)، حرص گناہ (سب رس

حیدر آباد نومبر۲۰۰۴ء بعنوان اجاڑ لمحوں کے آسیب)، موت کے سوداگر (کتاب نما دہلی ستمبر۲۰۰۴ء)، دشتِ وحشت انشاء کولکتہ مئی جون ۲۰۰۶ء، ادب لطیف لاہور)، آغوشِ ہوس (مباحثہ پٹنہ مارچ اپریل۲۰۰۴ء، صدائے اردو بھوپال ۱۵ مئی ۲۰۰۶ء)، گاڑی کا انتظار (خوشبو کا سفر حیدر آباد)، تخلیق کا کرب (انتخاب پٹنہ نمبر۸)

میں جناب افتخار امام صدیقی مدیر شاعر ممبئی، ڈاکٹر سیفی سرونجی مدیر انتساب سرونج مدھیہ پردیش اور جناب نذیر فتح پوری مدیر اسباق پونہ کا خاص طور سے سپاس ہوں کیوں کہ انھوں نے اپنے معتبر رسالوں میں میرے خصوصی گوشے شائع کر کے میرا تعارف اُردو کی نئی اور پرانی بستیوں میں بڑے پیمانے پر کروایا۔

اس کتاب کی کمپیوٹر کمپوزنگ وسیم احمد نے انجام دی جبکہ پروف ریڈنگ میں برج بہاری اور راجے کمار پنڈِتا نے میری مدد کی جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ناشر شبیر احمد، پراپرائٹر میزان پبلشرز کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کیوں کہ اُن کی معاونت، محنت اور لگن کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچانا مشکل تھا۔ جناب نور شاہؔ، ڈاکٹر فریدؔ پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری کا نام لیے بغیر یہ سپاس نامہ ادھورا رہے گا۔ انھوں نے ہمیشہ کی طرح اس تصنیف کی ترتیب و تزئین کے لیے مفید مشورے دیے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے دوست احباب ایسے ہیں جنھوں نے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی مرحلے پر میرا ہاتھ بٹایا۔ ان صاحبان کا فرداً فرداً ذکر کرنا مشکل ہے، اس لیے مجموعی طور پر میں ان سب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

**دیپک بُدکی**

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| ۱. | حرفِ آغاز | 1 |
| ۲. | ادھوری کہانی | 5 |
| ۳. | گھونسلا | 16 |
| ۴. | پہاڑوں کا رومانس | 23 |
| ۵. | معصوم علی | 30 |
| ۶. | کئی گاندھی اور | 36 |
| ۷. | ایک دو اور تین | 44 |
| ۸. | سرحدیں | 51 |
| ۹. | دو گز زمین | 56 |
| ۱۰. | گھر کا بیدی | 62 |
| ۱۱. | چڑی کی بیگم | 70 |
| ۱۲. | زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی | 78 |
| ۱۳. | اداس لمحوں کا کرب | 84 |
| ۱۴. | مغرور لڑکی | 90 |
| ۱۵. | شیر اور بکرا | 98 |
| ۱۶. | منقولہ خواب | 108 |

| | | |
|---|---|---|
| ۱۷. | آواز کا جادو | 114 |
| ۱۸. | حرصِ گناہ | 120 |
| ۱۹. | موت کے سوداگر | 128 |
| ۲۰. | دشتِ وحشت | 135 |
| ۲۱. | آغوشِ ہوس | 140 |
| ۲۲. | گاڑی کا انتظار | 148 |
| ۲۳. | قسمت کی پوٹلی | 152 |
| ۲۴. | تخلیق کا کرب | 159 |

# حرفِ آغاز

میرے افسانوں کا تیسرا مجموعہ پیش خدمت ہے۔ اس سے پہلے میرے دو مجموعے، 'ادھورے چہرے' اور 'چنار کے پنجے' بالترتیب ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آچکے ہیں جن کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی، یہاں تک کہ مجھے ادھورے چہرے کا دوسرا پیپر بیک ایڈیشن بھی چھپوانا پڑا۔ دوسرے ایڈیشن کی تین سو سے زائد کاپیاں برصغیر ہندو پاک، یوروپ اور امریکہ کے ادیبوں کو تحفتاً بھیج دیں۔ 'چنار کے پنجے' کی صرف پچاس کتابیں ملی تھیں، انہیں بھی اسی طرح مدیروں، ادیبوں اور تنقید نگاروں کو روانہ کیا۔ نتیجہ مثبت رہا۔ پڑھنے والوں نے، جن میں نامور شاعر، فکشن نگار اور نقاد شامل ہیں، میری ان کوششوں کو سراہا اور اپنی رائے سے نوازا جس کے سبب کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اسی دوران 'ادھورے چہرے' کا ہندی ایڈیشن اور تنقیدی مضامین و تبصروں پر مبنی کتاب 'عصری تحریریں' سال ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آگئیں۔

یہاں پر میں دو ادبی شخصیات کا ذکر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کیونکہ ان کے تاثرات پڑھ کر میری رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری محنت رائیگاں نہیں ہوئی۔ پہلی شخصیت معروف افسانہ نگار آنجہانی ہرچرن چاولہ ہیں جنہوں نے ناروے سے میرے پہلے افسانوی مجموعے پر مبسوط تبصرہ مرحمت فرمایا۔ تبصرہ کیا تھا، ایک بھرپور مضمون تھا جس میں ہر ایک کہانی پر رائے دی گئی تھی۔ انہوں نے جہاں ایک جانب 'رشتوں کا درد'، 'کینچلی'، 'ادھورے چہرے' اور 'کالا گلاب' افسانوں کو سراہا وہیں 'بیسوا' جیسی کہانیوں کو ناپسند بھی کیا۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہرچرن چاولہ کے تبصرے نے میرے اندر کے نقاد کو جگایا اور میں نے اس تبصرے کو ماڈل بنا کر بعد میں بے شمار تبصرے رقم کیے جو 'عصری تحریریں' کی صورت میں منظر عام پر آگئے۔ یہی بے باکی مجھے وارث علوی صاحب کے تاثرات میں بھی نظر آئی۔ وارث علوی تو خیر ایک نامور نقاد ہیں۔ ان کی گوناگوں مصروفیات کا اندازہ لگا کر مجھے اچنبھا ہوا کہ انہوں نے میری

دونوں کتابوں 'چنار کے پنجے' اور 'عصری تحریریں' کا مطالعہ کیا اور اپنے بصیرت افروز تاثرات سے میری رہنمائی فرمائی۔ انہوں نے بھی جہاں ایک جانب مخبر، اماں، اور ایک نہتے مکان کا ریپ کی تعریف کی وہیں جنسی موضوعات پر لکھی کہانیوں کو بے اثر ٹھہرایا۔ افسانہ ایک نہتے مکان کا ریپ، کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''یہ اُردو میں اپنی نوعیت کا اچھوتا افسانہ ہے۔ اس پر تمہیں جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے''۔ ساتھ ہی موصوف نے اِن الفاظ میں میرے لیے دعا بھی کی: ''بہرحال تم میں افسانہ نگاری کی خداداد صلاحیت ہے۔ اس صلاحیت کا صحیح استعمال تمہیں آسمان ادب کا درخشندہ ستارہ بنا سکتا ہے اور میری خواہش اور دعا ہے کہ تم چمکو''۔

مجھے پورا یقین ہے کہ جس زبان میں ایسے معتبر ادیب اور نقاد موجود ہوں وہ زبان کبھی مر نہیں سکتی۔ ان تاثرات کے علاوہ بھی بے شمار تنقیدی مضامین اور تبصرے موصول ہوئے جن کا الگ الگ ذکر کرنا ممکن نہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ ہر خط میں کہیں نہ کہیں کوئی رمز چھپا ہوا تھا جس سے میں نے حتی المقدور استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ وارث علوی کے خط کا حوالہ دینے کا مقصد اپنی تعریف اور توصیف کو اُجاگر کرنا نہیں بلکہ ان کی فراخدلی اور قدر شناسی کا اعتراف کرنا ہے۔ آج اُردو ادب میں ایسے ہی ناقدین کی ضرورت ہے جو نئے تخلیق کاروں کے لیے چراغِ راہ بن سکتے ہیں۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ زندگی میں ساری آسائشیں حاصل ہونے کے باوجود مجھے افسانے رقم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ اس ڈھلتی عمر میں جب میرا جسم بلڈ پریشر اور دیگر عارضوں سے جوجھ رہا ہے اور آنکھوں کی بینائی بھی جواب دینے لگی ہے، دیر رات تک مطالعہ کرنا، افسانے لکھنا اور پھر تصحیح کر کے ان کو فیئر کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ شاید یہ میری طبیعت ثانی بن چکی ہے اور اب میں اس کے بغیر جی بھی نہیں سکتا۔

میں نے اپنے اوّلین مجموعے میں لکھا تھا کہ میرا ادبی سفر دراصل ۱۹۹۶ء میں شروع ہوا گو میں نے ۱۹۷۰ء میں پہلی بار قلم ہاتھ میں اُٹھایا تھا۔ ۱۹۷۶ء سے لے کر ۱۹۹۵ء تک میں ذہنی تعطل کا شکار رہا اس لیے تخلیقی کام کی طرف دھیان نہیں دے سکا۔ ۱۹۹۶ء کے بعد گیارہ برسوں میں ساٹھ سے زیادہ افسانے لکھ چکا ہوں اور اس کے علاوہ تنقیدی مضامین و تبصروں کی ایک ضخیم کتاب بھی قلمبند کر چکا ہوں۔ یہ سب کارروائی اس جنون کی دین ہے جس نے مجھے اردو زبان

خاص کر اردو افسانے سے جوڑے رکھا ہے۔ بارہا کئی خیرخواہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں انگریزی یا ہندی میں لکھا کروں تا کہ اس سے مالی فائدہ بھی ہو۔ دوسری طرف چند ایک کشمیری ادیبوں کا اصرار تھا کہ مجھے اپنی مادری زبان کشمیری میں لکھنا چاہئے کیونکہ اظہارِ خیال کے لیے مادری زبان سے بڑھ کر اور کوئی زبان نہیں ہوسکتی۔ لیکن میرا دل نہیں مانا۔ میں نے نہ تو اپنے تخلیقی کام کو ذریعۂ معاش بنانے کی کوشش کی اور نہ ہی میرے ذہن میں کبھی مالی فائدے کی بات آئی۔ میں کسی اور زبان میں، چاہے وہ میری مادری زبان ہی کیوں نہ ہو، اس لیے نہیں لکھتا کیونکہ میں دوہری ادبی زندگی نہیں جینا چاہتا۔ ایسی ترکیبوں میں فائدے لاکھ سہی مگر میری طبیعت کو صرف اُردو ہی راس آئی ہے اس لیے میں اب تک اسی زبان کی خدمت کر رہا ہوں۔ یہ زبان نہ میری مادری زبان ہے اور نہ ہی ذریعہ تعلیم رہی ہے۔ یہ میری اختیاری زبان ہے اور اس زبان سے مجھے بے حد محبت ہے۔

اس مجموعے میں شامل افسانے ۲۰۰۰ء کے بعد رقم کیے گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان افسانوں کو قارئین پسند فرمائیں گے اور اپنے تاثرات سے ضرور نوازیں گے۔

دیپک بُدکی

جموں۔توی ۱۸۰۰۰۱

۱۹ مئی ۲۰۰۷ء

# ادھوری کہانی

بہت سال پرانی بات ہے۔ میرے دادا جی جب بھی موقع پاتے مجھے سامنے بٹھا کر کہانی سنایا کرتے۔ کبھی پنچ تنتر کی اور کبھی جاتکوں کی۔ اس روز بھی وہ کہانی سنا رہے تھے لیکن انہیں بار بار کھانسی کے دورے پڑ رہے تھے اور سانس بھی پھول رہی تھی۔ وہ بیچ میں رُک جاتے، تھوڑا سا پانی پیتے اور اپنے سینے کو داہنے ہاتھ سے دبا کر پھر شروع ہو جاتے۔ کہانی یوں تھی:

سُندر بن میں ایک سوامی جی رہتے تھے۔ چاروں ویدوں کو امرت کی طرح گھول کر پی چکے تھے۔ ایک روز کولکتہ کے ایک امیر ساہوکار ان کے آشرم میں حاضر ہوئے۔ زمین بوسی کی اور کہنے لگے، ''سوامی جی، جیون میں ایسی کوئی چیز نہیں جو مجھے میسر نہ ہو۔ اسکے باوجود نہ مجھے سُکھ ہے اور نہ ہی چین۔ ہر دم پریشان رہتا ہوں۔ رات بھر نیند نہیں آتی۔ بھلا ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا کوئی اُپائے بتایئے۔''

سوامی جی نے پاس ہی رکھے ہوئے مٹی کے گھڑے میں سے تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ایک کلھڑ میں انڈیل کر سیٹھ جی کو پیش کیا۔ '' آپ بہت دور سے آئے ہیں۔ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، تھوڑا سا پانی پی لیجیے''۔

سیٹھ جی نے، جو ساہوکاری کے ساتھ جوہری کا کام بھی کرتے تھے، پانی غٹ غٹ کر پی لیا۔ یکا یک انہیں ایسا لگا جیسے اُن کی ساری تھکان کافور ہو چکی ہو۔ اُن کی آنکھوں میں غنودگی چھا گئی اور وہ وہیں فرش پر لیٹ کر سو گئے۔ رات کیسے بیت گئی انہیں پتا بھی نہ چلا۔ صبح سویرے اُٹھ کر وہ سیدھے سوامی جی کے درشن کرنے کے لئے ان کی کٹیا میں چلے گئے۔

''آپ تو کہتے تھے کہ آپ کو نیند نہیں آتی ہے۔ آپ تو رات بھر خوب سوتے رہے''۔ سوامی جی نے نگاہیں اٹھائے بغیر پوچھ لیا۔ اُن کے لہجے میں طنز تھا۔

''سوامی جی، میں خود بھی حیران ہوں کہ آج رات میں کیسے گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔ نہ اپنی فکر رہی نہ دنیا و مافیہا کی۔ ہاں، جاگنے سے پہلے ایک خواب ضرور دیکھ لیا جس نے تھوڑا بہت پریشان کر دیا۔ میں کسی لمبی سڑک پر چلا جا رہا تھا اور میرے پیچھے سینکڑوں لوگ چلے آ رہے تھے۔ میں مسلسل اپنے روپ بدل رہا تھا۔ پہلے بُلبُل کا روپ دھارن کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدھا بن گیا اور آخر میں کتے کا روپ اختیار کر کے بھونکتا رہا۔ کسی راہ گیر نے میری طرف دھیان بھی نہ دیا۔ دریں اثناء چڑھتے سورج کی شعائیں کھڑکی سے گھس کر میرے چہرے پر پڑیں اور میری آنکھ کھل گئی۔ میرا خواب ادھورا ہی رہ گیا۔ مجھے اس خواب کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا''۔

''سمجھ میں کیوں نہیں آیا؟ مطلب تو صاف ظاہر ہے۔ اس میں کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں ہونی چاہیے''۔ سوامی جی ان تینوں علامتوں کا مطلب سمجھانے لگے۔

اتنا کہہ کر دادا جی کو زوردار کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ میں نے اُٹھ کر ان کے ہونٹوں کے ساتھ پانی کا گلاس لگا دیا۔ کچھ گھونٹ پی کر انہوں نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا، 'اوم، ہری اوم' کہہ کر آخری ہچکی لی اور وہیں پر اپنے پران تیاگ دیے۔

اُس وقت تک میں دادا جی کی کہانیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ انہیں محض تفریح کا سامان سمجھتا تھا مگر اس روز میرے دل میں نہ جانے کیسی خلش سی پیدا ہوگئی کیونکہ دادا جی نے وہ کہانی ادھوری چھوڑ دی تھی۔ میں ان علامتوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ موت تو خیر ایک نہ ایک دن آنی ہی تھی البتہ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس روز دادا جی کوئی اسرار کھولنا چاہتے تھے جبکہ اجل نے انہیں مہلت نہ دی۔

دادا جی اکثر اپنے کمرے کے گھٹے ہوئے ماحول میں اکیلے پڑے رہتے تھے لیکن زبان سے کبھی اُف تک نہ کرتے۔ بسر اوقات کے لیے حقہ پیا کرتے تھے جبکہ میری ماں کو تمباکو کی بدبو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہ خود ان کے کمرے میں جاتیں اور نہ بچوں کو جانے دیتیں۔ اگر کبھی کبھار مجبوراً جانا بھی پڑتا تو ناک پر موٹا سا کپڑا لپیٹ کر چلی جاتیں۔ مہینے میں ایک دو مرتبہ کمرے کی صفائی ہوتی۔ طاقچوں پر رکھی ہوئی بوسیدہ جنتریاں، رامائین، مہابھارت اور دیگر کتابیں سرسری طور پر یوں جھاڑی جاتیں گویا ان میں دق کے جراثیم پوشیدہ ہوں۔ جس چوکی پر حقہ وغیرہ رکھا رہتا اس کے پاس کوئی پھٹکنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

دادا جی کر بھی کیا سکتے تھے۔ اس عمر میں ان عادتوں سے چھٹکارا پانا ممکن نہ تھا۔ پھر ایک متوسط گھرانے میں نوکر چاکر بھی تو دستیاب نہیں ہوتے۔ البتہ میں ماں سے نظریں بچا کر دادا جی کا حقہ صاف کر دیتا، نلکے سے اس میں تازہ پانی بھر لاتا اور جلانے کے واسطے دادا جی کے سامنے ماچس اور گتّے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ دیا کرتا۔ میری ماں کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ بار بار تنبیہ کرتیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں مجھے بھی تمبا کو نوشی کی عادت نہ پڑ جائے۔ کبھی کبھار جب میں دو چار روز کے لیے اپنے ننھیال چلا جاتا تو دادا جی کو کوفت ہوتی، چہرہ مرجھا جاتا اور ان کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتیں۔ میری عدم موجودگی میں انہیں یا تو خود ہی بازار جانا پڑتا تھا یا پھر پاس پڑوس کے کسی لڑکے سے مجبوراً گھٹیا قسم کے سگریٹ منگوانے پڑتے تھے کیونکہ پنشن کی قلیل رقم سے مہنگے سگریٹ خریدنا ممکن نہ تھا۔

وہ مجھے بات بات پر بلاتے۔ چاہے کام ہو یا نہ ہو۔ اکثر نئی نئی کہانیاں سناتے اور میں خوشی خوشی ان کا حکم بجالاتا۔ مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ مجھ سے...... ہم سب سے...... افسوس ان کی کوئی سنتا ہی نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کے تجربات سے ہمیں فیض پہنچانا چاہتے تھے لیکن ان کی باتیں سننے کیلئے کسی کے پاس فرصت ہی نہ تھی۔ بہر حال میری بات الگ تھی۔ میں اپنے والدین سے زیادہ دادا جی کو چاہتا تھا۔ اس لیے ان کا دل کسی طور بھی دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے پاس پند و نصائح سے بھری کہانیوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا جنہیں وہ دوسروں کو سنانے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ اس اذیت سے بچنے کے لیے ان کے کمرے میں کوئی بھی آدمی قدم نہیں رکھتا تھا۔ اگر مجبوری میں کسی کو جانا بھی پڑتا وہ پہلے ہی ماں سے طے کر کے آتا کہ دو چار منٹ کے اندر ہی اس کو چائے پینے کے بہانے بلایا جائے تا کہ اُسے بڈھے کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرنا پڑے۔

ایک بات میری سمجھ میں کبھی نہ آئی۔ دادا جی جب صبح سویرے جاگتے تھے وہ کنبے کے سبھی افراد کو ایک ایک کر کے کیوں جگاتے تھے؟ مرغ کی بانگ کے ساتھ ہی اُٹھ بیٹھتے، منہ ہاتھ دھوتے اور پھر اونچی آواز میں بھگوان کی پوجا پاٹ کرتے۔ پھر ہر ایک فرد کو نام لے لے کر پکارتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر جاگ اُٹھتا۔ میں اور میری بہنیں اپنے اپنے بستے، کتابیں اور یونیفارم ڈھونڈنے لگ جاتے۔ ماں کچن میں ناشتہ تیار کرنے اور لنچ کے لیے پراٹھے بنانے میں

مشغول ہو جاتیں۔صرف پتا جی سوئے رہتے۔شاید آفس میں کام کرنے کی وجہ سے بہت تھک جاتے تھے۔

''کرشنا، ارے او کرشنا۔ ابھی تک نہیں جاگا؟ دفتر کے لیے دیر ہو رہی ہے۔ پھر نہائے دھوئے گا کب؟ کتنا سوتا رہتا ہے تو؟ آلسی کہیں کا۔اُٹھ، دیر ہو رہی ہے''

یہ سلسلہ تب تک جاری رہتا جب تک پتا جی کے سکوٹر کی پھٹ پھٹ آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچتی اور پھر انہیں اطمینان ہو جاتا کہ چلو ٹھیک ہوا۔اب کرشن لال ٹائم سے دفتر پہنچ جائے گا۔ دادا جی ریلوے محکمہ میں مینٹیننس انجینئرنگ وِنگ میں ملازم تھے۔اپنے اثر ورسوخ سے انہوں نے پتا جی کو بھی وہیں پر نوکری دلا دی تھی۔انگریزوں کا زمانہ تھا، ٹائم کی پابندی تھی، دادا جی کے پاس اپنی مخصوص پاکٹ واچ تھی۔آدھا گھنٹہ پہلے ہی دفتر میں حاضری لگاتے۔اب تو وقت ہی الٹ گیا ہے۔دفتر کھلنے کے آدھے گھنٹے بعد بھی کوئی حاضر نہیں ہوتا۔یا تو اس بات کا علم دادا جی کو نہیں تھا یا پھر وہ جان بوجھ کر انجان بنے رہتے۔انہوں نے آزادی سے قبل ۱۹۴۵ء ہی میں محکمے سے اپنی جان چھڑائی تھی۔اسی لئے انہیں ہمیشہ یہ خدشہ رہتا تھا کہ کہیں ان کا بیٹا کرشن لال دیر سے آفس نہ پہنچے اور اُسے دفتر میں افسر کی کھری کھوٹی سننی پڑے۔

زمانہ کتنا بدل گیا۔ابھی حال ہی کی بات ہے۔میرا بیٹا اپنی ماں سے دو ہزار روپے مانگ رہا تھا۔میں بھونچکا سا اس کو دیکھتا رہا۔دو ہزار!اتنی بڑی رقم تو میں نے پہلی بار تب دیکھی تھی جب میں انڈین بنک میں کیشیئر لگ چکا تھا۔

''تمہیں اتنی ساری رقم کس لیے چاہیے؟''اس کی ماں نے استفسار کیا۔

''سونو کا برتھ ڈے ہے۔گفٹ دینا ہے''

''یہ سونو کون ہے؟''

''ممی، تم بھی اب بہت سارے سوال کرنے لگی ہو۔سونو اِز مائی فرینڈ''

''یوور فرینڈ!پچھلے اسٹیشن پر شفالی تھی۔اس سے پچھلے اسٹیشن پر پمی تھی اور اب یہ سونو کہاں سے آگئی؟''

''اوہ ممی، شی از مائی اونلی لَو''

''وہ تو تم شفالی اور پمی کے بارے میں بھی کہتے تھے''۔

''نومی۔اب کی بار فائنل۔ بالکل فائنل ہے۔بس سونو میری سب کچھ ہے۔قسم سے''

اور پھر شفالی، پمی اور سونو۔ نہ جانے کتنی آتی رہیں اور جاتی رہیں اور وہ بھنورے کی مانند کلیوں پر منڈلاتا رہا۔اس وقت مجھے دادا جی کی بہت یاد آئی۔ایک روز میں نے اپنا رزلٹ کارڈ دادا جی کو دکھایا تھا۔وہ بہت خوش ہوئے۔کہنے لگے''اپنا ہاتھ ذرا آگے بڑھاؤ''۔

میں نے اپنا ننھا سا ہاتھ سامنے کر دیا۔انہوں نے میری ہتھیلی پر ایک بھاری بھرکم اُٹھنّی رکھ دی اور میری مٹھی بند کر کے رازدارانہ لہجے میں کہنے لگے''یہ میری طرف سے تم کو کلاس میں فرسٹ آنے کا انعام''۔

میں نے اُٹھنّی اپنی مٹھی میں زور سے بھینچ لی جیسے کوئی اشرفی ملی ہو۔دادا جی کے پوپلے منہ پر ایک پیار بھرا بوسہ ثبت کیا اور پھر یہ جا وہ جا۔ان دنوں میں بھی لاابالی تھا۔نہ جینے کی پرواہ نہ مرنے کا غم۔ جہاں مرضی چلا جاتا۔جو چاہتا کھالیتا۔جدھر اچھا لگتا بیٹھ جاتا۔اپنی مٹھی میں اُٹھنّی دبوچے میں چاکلیٹ کی دکان پر چڑھا اور چاکلیٹ کی قیمت پوچھی۔ایک روپے سے کم تو کوئی بھی چاکلیٹ نہ تھی۔اس لیے جے بی منگارام ٹافی پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔اس کے باوجود مجھے وہ اُٹھنّی قارون کے خزانے سے کم نہیں لگ رہی تھی۔میرے پتا جی مجھے ہر مہینے دس روپے بطور پاکٹ منی دیا کرتے تھے۔امتحان میں اول آنے پر ممی ڈیڈی دونوں نے مجھے ایک گھڑی انعام میں دی تھی جس کی قیمت پچاس روپے سے کم نہ تھی پھر بھی نہ جانے کیوں ان ٹافیوں میں زیادہ مٹھاس تھی۔

دادا جی بھی کتنے بھولے تھے۔انہیں لگتا تھا کہ اُٹھنّی دے کر انہوں نے تختِ طاؤس میرے حوالے کر دیا ہو۔جس دم انہوں نے اپنا ہاتھ اُٹھنّی نکالنے کے لیے اپنی صدری میں ڈالا تھا ان کے چہرے پر عجیب سی تمتماہٹ پیدا ہو گئی تھی۔وہ برسوں پہلے ایک سو دس روپیہ مہینہ پنشن پر ریٹائر ہو چکے تھے اور ان کے لیے تب سے وقت تھم چکا تھا۔ان کی زندگی ریل کے متروک ڈبے کی مانند تھی جسے دور کسی غیر استعمال شدہ پٹری پر چھوڑ دیا گیا ہو۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ میرے اصرار پر ایک روز دادا جی نے مجھے ایک روپے کی بانسری خرید کر دی تھی۔میں اسے اسکول لے جاتا اور ریسس کے دوران بجانے کی کوشش کرتا۔ڈرل ماسٹر کو جب اس بات کا علم ہوا انہوں نے مجھے اسکول بینڈ میں شامل کر دیا اور مجھے بانسری بجانا سکھا دیا

اسکول سے واپس آ کر جھٹپٹے کے وقت میں بانسری بجاتا ہوا دور پہاڑی پگڈنڈیوں پر چل نکلتا۔ چیڑ اور صنوبر کے درختوں کے درمیان ایک طرف کوئل کوک اٹھتی اور دوسری طرف میری بانسری بج اٹھتی۔ دونوں کسی بے نام ہمسفر کی تلاش میں تھے۔

ایک روز اچانک ایک لڑکی نے میری پیٹھ پر دھپ سے تھپکی دی اور پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ ''کیوں پہچانا؟''۔ وہ بدستور ہنستی رہی لیکن میں اس اجنبی کو دیکھ کر ہکا بکا سا رہ گیا۔ میں کچھ کہنے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ ہنستے ہوئے گویا ہوئی۔

''میرا نام شانتی ہے شانتی...... پر تم شانتی کو کیسے جانو گے۔ ارے مورکھ میں شنو ہوں شنو۔ دینو کاکا کی بیٹی جس کی بغل میں بیٹھ کر تم کاکا سے سبق پڑھا کرتے تھے''۔

''اری شنو، تم اتنی بڑی ہوگئی ہو! کہو پنڈت جی کیسے ہیں؟''

''تم بھی تو............ ہائے رام............ بھگوان بری نظر سے بچائے''۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو اور وہ بھی اس اندھیرے میں؟''

''تمہاری بانسری سننے آئی ہوں۔ یوں تو ہر روز اپنی کھڑکی پر بیٹھے سنا کرتی ہوں۔ آج سوچا چلو مل ہی آؤں''۔

اس روز کے بعد ہم دونوں اکٹھے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑی پگڈنڈیوں میں کھو جاتے اور رات گئے لوٹ آتے۔

''وہاں اسکول میں بھی کوئی بانسری سننے والی ہے یا نہیں؟'' شنو نے اپنے دل کا غبار نکالا۔

''تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

''کوئی بھی...... میری طرح...... جو اسکول میں تمہاری دیوانی ہوگئی ہو''۔

میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''وہ تو صرف لڑکوں کا اسکول ہے۔ وہاں لڑکیوں کا کیا کام''۔

''چلو مانا اسکول میں نہیں۔ کہیں راستے وغیرہ میں تو مل ہی گئی ہوگی''۔

''اری پگلی، پڑھنے سے فرصت ملے تب نا۔ یہاں تو مرنے کی فرصت نہیں تو تانک جھانک کیا کریں''۔

شنو نے چین کا سانس لیا اور اطمینان سے گھر کی راہ لی۔ میں جونہی گھر میں گھسا تو ممی کو

منتظر پایا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بڑبڑانے لگیں۔ میں سر جھکائے چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ اتنے میں پتا جی بھی آ گئے اور پھر ممی کا نزلہ ان پر اُتر آیا۔

''کہاں رہتے ہیں اتنی دیر؟ کچھ ٹھور ٹھکانہ ہی نہیں۔ دنیا میں سبھی لوگ نوکری کرتے ہیں۔ شام کو پرندوں سے پہلے ہی اپنے گھونسلوں میں لوٹ آتے ہیں اور ایک آپ ہیں۔ دن کی خبر نہ رات کی۔ بیوی کی خبر نہ بچوں کی۔ بیوی زندہ ہے یا مر گئی۔ آپ کو اس سے کیا غرض؟''

پتا جی کا بھی پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی سنائی۔

''کوئی رکھیل نہیں ہے جس کے پاس شام کو جاتا ہوں۔ کام ہی ایسا ہوتا ہے۔ شام کو اوور ٹائم کرنا کوئی پاپ تو نہیں اور پھر کرتا بھی تو تمہیں لوگوں کی خاطر ہوں۔ ایک تو دن رات گدھے کی طرح کام کرو اور اوپر سے طعنے بھی سنو''۔

''رکھی بھی ہو تو کیا معلوم۔ جورکھتے ہیں ان کے پَر تو نہیں لگے ہوتے''۔

''ہاں ہاں میں نے رکھی ہے۔ روز اُسی کے پاس چلا جاتا ہوں۔ تمہیں جو جی میں آئے کرلو''۔

''پھر اسی کے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں تمہارے لئے کون پریشان ہو رہا ہے۔ جاؤ وہیں چلے جاؤ''۔ ممی کا لہجہ اب بالکل بدل چکا تھا۔ وہ 'آپ' کے بدلے 'تم' پر اُتر آئی تھی۔

''جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ ایسا ہی معاملہ رہا تو ایک دن ضرور چلا جاؤں گا۔ میری تو قسمت پھوٹی تھی جو تم جیسی گنوار عورت سے شادی کرلی''۔

''بھاگ تو میرے پھوٹے تھے جو تمہارے پلے پڑ گئی۔ میری تو زندگی دوبھر ہو چکی ہے۔ اب تو اس گھر میں دم گھٹنے لگا ہے''۔

''دم گھٹتا ہے تو اس گھر میں رہتی ہی کیوں ہو؟''

''اندھیرا ہے۔ نہیں تو ابھی چلی جاتی''۔

''جاؤ، کون روکتا ہے''۔

''ٹھیک ہے۔ صبح ہونے دو۔ میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ بھائی بھاوج کو بھاری تو نہ پڑوں گی۔ اب تو ضرور جاؤں گی۔ اتنا نِرآدر نہیں سہہ سکتی۔ سمجھ کیا رکھا ہے تم نے۔ یہ آخری بار

ہے۔اب کبھی واپس نہ آؤں گی‘‘۔

اس رات میں بہت ڈر گیا۔ دونوں کے تیور عجیب سے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ماں نے پتاجی کے ساتھ غصے میں بات کیوں کی۔ ایک تو صبح سے شام تک ہمارے پیٹ پالنے کے لیے کام کریں پھر اس پر اوور ٹائم۔ کس لیے؟ ہمیں طرح طرح کی سُکھ سُو دھائیں مہیا کرنے کے لیے۔ خود تو کئی برسوں سے اپنے لیے ایک گز نیا کپڑا بھی نہیں خریدا۔ یہاں ہماری فرمائش منہ سے نکلی نہیں اور چیز فوراً حاضر۔ بیچارے پاپا، کتنا خیال رکھتے تھے ہم سب کا۔

یہ گرہست آشرم بھی آدمی کو کچھ سوچنے نہیں دیتا۔ پتاجی کو سوتے جاگتے بس ہماری فکر لگی رہتی تھی۔ کتنے پیٹ پالنے پڑتے تھے۔ ہمیشہ تنگ دست رہتے تھے مگر اُف تک نہیں کرتے تھے۔ بیچارے صبح نکل جاتے اور رات گئے تک لوٹتے تھے۔ پندرہ سالہ پرانا بجاج ان کا ہمسفر تھا۔ دونوں کی حالت ایک جیسی تھی۔ دن بھر بوجھ اٹھاتے رہتے تھے۔ بچوں کو صبح اسکول چھوڑتے، پھر دفتر جاتے، لنچ ٹائم پر میری چھوٹی بہنوں کو گھر لے آتے، پھر واپس دفتر اور اس کے بعد رات کو گھر لوٹتے۔ ساگ سبزی لانا سو الگ۔ پاپا دیر رات تک بچوں کو اسکول کا ہوم ورک کراتے۔ یہ کام تو ممی بھی کر سکتی تھیں مگر انہوں نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا لی کہ بچوں کو آپ نے بگاڑ دیا ہے اب مجھ سے کنٹرول نہیں ہوتے۔ وہ تو بس کچن میں گھسی رہتیں۔ کبھی کھانا پکانے میں مشغول اور کبھی پوجا پاٹ میں مصروف۔ اب تو پتاجی کی کمر میں درد بھی رہنے لگا تھا اور بلڈ پریشر کی شکایت بھی رہتی تھی۔ ڈاکٹر نے صلاح دی تھی کہ صبح سویرے اور رات کو کھانا کھانے کے بعد سیر کیا کرو مگر انہیں فرصت ملے تب نا۔ وہ تو بس کام، کام اور کام۔

وہ رات تو واقعی کالی رات ثابت ہوئی۔ اتنی ٹھنی کہ پھر کبھی نہ پہلے کی طرح بن پائی۔ ماں نے اپنا بستر باہر ڈرائنگ روم میں بچھا دیا۔ میں نے ٹوٹے ہوئے رشتوں کے قصے سنے تھے۔ ڈر رہا تھا کہیں ماں باپ کی آپسی دھمکیاں سچ ثابت نہ ہوں۔ میرا اور میری چھوٹی بہنوں کا کیا حشر ہوگا۔ پتاجی رکھیل کے پاس جائیں گے اور ماتاجی اپنے بھائی بھاوج کے پاس۔ پھر ہم لوگ کہاں جائیں گے؟

دو چار روز فضا میں کافی تناؤ رہا۔ طرفین پہل کرنے میں ہچکچا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں کس نرک میں آ کر پھنس گیا ہوں۔ ان دونوں کو ملانے کی کوئی تدبیر سوجھ نہیں رہی تھی۔

اگلے اتوار کی صبح میں نے ناشتے کے لیے فریج سے دو تین سیب نکالے اور انہیں چھیلنے لگا۔ اچانک میرا چاقو میری بائیں ہاتھ کی چھنگلی میں لگ گیا اور خون بہنے لگا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ایک جانب سے ممی دوڑ پڑیں اور دوسری جانب سے ڈیڈی۔ پتا جی نے میری چھنگلی زور سے دبائی اور ماں کو حکم دیا۔

''اری منہ پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو۔ جلدی سے ڈیٹول کی شیشی اور روئی لے آؤ۔ سامنے دراز میں بینڈ یج پڑا ہے وہ بھی لے آنا''

ممی تینوں چیزیں اٹھا کر لے آئیں۔ پتا جی نے پھر حکم دیا۔

''دوائی کے ڈبے میں نیبا سلف کی بوتل رکھی ہوئی ہے۔ وہ بھی لے کر آنا''۔

ممی نے نیبا سلف پوڈر بھی لا کر دیا۔ پتا جی نے زخم پر پٹی باندھ دی۔ اتنی دیر میں ممی ہلدی ملا ہوا دودھ کا گلاس لے کر چلی آئیں۔

دونوں کے درمیان مکالمہ بحال ہو گیا۔ اس سمجھوتے کے لیے میرے خون کے چند قطرے گراں نہ تھے۔ دفعتاً میں سوچنے لگا کہ آخر کب تک میرا خون ان دو بے میل دلوں کو جوڑتا رہے گا۔ اس دن کے بعد جب کبھی بھی میرے سامنے اُن کی ان بن ہو جاتی تو میرے شریر میں ہلچل سی مچ جاتی اور میرا لہو بہنے کے لیے تڑپ اُٹھتا۔ سارا بدن تپنے لگتا، سر میں شدید درد اٹھتا اور میں چیخنے لگتا۔

شنو کے ماں باپ نے اس کی شادی کر دی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے پتا جی ہمارے ساتھ رشتہ جوڑنے کے خلاف تھے۔ وہ اونچی ذات کے برہمن تھے گو ان کا گھر افلاس و غربت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ شنو کی ماں نے اشارہ تو کیا تھا مگر اپنے شوہر کے تیور دیکھ کر چپ رہی۔

''اری پڑھنے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ بنک کا ملازم ہے تو کیا ہوا۔ اپنی ذات برادری میں ناک نہیں کٹوانی ہے۔ میں بیٹی کو بن بیاہی رکھوں گا لیکن اپنی ذات کے باہر ہرگز نہیں دوں گا۔ آگے پھر کبھی ایسے وِچار اپنے من میں نہیں لانا''۔

شنو کی ماں خاموش ہو گئی تھی۔ شنو کے ارمان اور اس کی تمنائیں اس کے من کے اندر ہی دب کر رہ گئی تھیں۔ پھر ایک روز دوسرے گاؤں سے ایک ڈاک ہرکارہ شنو کو بیاہ کر لے گیا اور سارا گاؤں دیکھتا رہ گیا۔ میں بھی نامراد اس ڈولی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میرے من میں اس وقت اتھل پتھل مچی ہوئی تھی مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔ بیسویں صدی میں بھی میرے دیش کو ذات

پات۔ نے جکڑ کر رکھا ہے۔ بے شمار ہندوستانی لڑکیاں مجبور ولاچار خاموش معصوم بھیڑوں کی طرح ہانکی جاتی ہیں۔ چاہے ان کے دلوں میں طوفان ہی کیوں نہ اُٹھ رہا ہو، وہ آہ تک بھی نہیں کر پاتیں۔ چپ چاپ سب کچھ سہہ لیتی ہیں۔ پھر یہ دستور! یہ آزادیٔ نسواں! یہ انصاف کے مینار! یہ سب ڈھکوسلے ہیں ڈھکوسلے۔ دکھاوے اور دل بہلاوے۔ امیر زادیوں کے کھلونے۔ غریب لڑکیوں کے بہکاوے۔ غریب عورت کو انصاف تب مل سکتا ہے جب وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔ یہاں تو دروازہ کھٹکھٹانے کی نہ کسی میں جرأت ہے اور نہ طاقت۔ پھر کہاں کا دستور اور کہاں کا انصاف۔ میں نے کئی بار شنّو کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی ترغیب دی تھی۔ اس کی ہمت بندھائی تھی۔ اُسے سماج کے خلاف بغاوت کا پرچم اُٹھانے کی تلقین کی تھی مگر لاکھ کوشش کے باوجود وہ نہ مانی۔ اُسے اپنے خاندان کی عزت زیادہ عزیز تھی۔

وقت کے جیسے پَر لگ گئے۔ ایک روز میں نے اپنا چہرہ غور سے آئینے میں دیکھا۔ پاپا کا ڈپلی کیٹ لگ رہا تھا۔ پاپا بھی اب کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ دادا جی تو عرصہ پہلے بھگوان کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان کی یادیں مجھے رہ رہ کر تڑپاتی تھیں۔ بیچارے دادا جی نے اپنے آخری سفر کے لئے کتنا طویل انتظار کیا تھا۔ اس کے برعکس پتا جی اتنا انتظار نہیں کر پائے۔ اچانک سیری بَرل ہیمر یج کی وجہ سے ان کے دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی۔ اسپتال میں داخل کرانے سے پہلے ہی راہِ عدم اختیار کر لی۔ ان دنوں میری پوسٹنگ ملک کے شمال مشرقی علاقے میں تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے دو دن لگ گئے۔ تب تک ان کا داہ سنسکار کیا جا چکا تھا۔ ان کے بدلے مٹی کے گھڑے میں رکھی ہوئی مٹھی بھر راکھ میرا انتظار کر رہی تھی۔ سنا ہے کہ مرتے دم تک ان کی آنکھیں دروازے کی طرف دیکھتی رہیں۔ ان کا اَنتم سنسکار کرنا بھی نصیب نہ ہوا کیونکہ خاندان کے بڑے بزرگوں نے لاش کو گھر میں زیادہ دیر رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پتا جی کی روح کے لیے عذاب دہ ہوگا۔ میری آنکھیں مدتوں اپنے پتا جی کو ڈھونڈتی رہیں۔ وہ کبھی سوپن میں بھی اپنے درشن نہیں دکھاتے۔

البتہ کل رات دادا جی خواب میں چلے آئے۔ میری خیر خبر پوچھنے لگے۔ انہیں یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ میں اس کہانی کو، جو انہوں نے ادھوری چھوڑ دی تھی، پوری طرح سننے کے لیے اب تک مضطرب ہوں۔ کہنے لگے "بیٹے تم خود ان مرحلوں سے گزر چکے ہو۔ پھر یہ مایوسی کیسی۔

اپنی ہی زندگی پر نظر ڈالو ان علامتوں میں پوشیدہ راز سمجھ جاؤ گے"۔

میں نے مڑ کر اپنی زندگی پر نظر ڈالی۔ پھر اپنے اندر جھانک کر دیکھا میرے اندر کا گدھا اب تھک چکا تھا اور کتا بھونکنے لگا تھا۔

●□●

# گھونسلا

میں نے اپنا آفس چند روز پہلے ہی وادی سے باہر منتقل کیا تھا۔ وہاں حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ کام کرنا مشکل ہوگیا تھا اور پھر اس بارے میں اوپر سے بھی آرڈر آچکا تھا۔ پریشانی صرف اتنی تھی کہ جائے تنگ است و مردماں بسیار۔ کم سے کم ایک تین منزلہ مکان کی ضرورت تھی۔ تلاشِ بسیار کے بعد آخر کار ریلوے اسٹیشن کے متصل اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ کی بلڈنگ پر قناعت کرنی پڑی۔

پہلے دن دفتر کے سبھی ملازموں کو اکٹھا کیا۔ انہیں نازک حالات سے آگاہ کیا اور اپنے آپ کو بدلے ہوئے ماحول میں ڈھالنے کی ہدایت دی کیونکہ اب پہلے جیسی سہولتوں اور آسائشوں کی امید کرنا فضول تھا۔ غیر یقینی مستقبل کے سبب وہ پہلے ہی سے دل شکستہ تھے۔ اس لیے انہوں نے میری تجویز کسی اگر مگر کے بغیر مان لی اور پورے سمرپن، بلیدان اور لگن سے کام کرنے کا آشواسن دیا۔ وقت ضائع کیے بغیر ہم سب آفس کی تشکیل نو میں جٹ گئے۔

جہاں تک میرا سوال تھا، میں نے اپنے لیے ایک چھوٹا سا ہوادار کمرہ، جس کی کھڑکیاں ریلوے پلیٹ فارم کی جانب کھلتی تھیں، مختص کیا۔ اس کمرے کی سجاوٹ میں نے اپنے ذمے لے لی۔

فرش پر ایک خوشنما قالین بچھوایا اور کھڑکیوں پر کریول ایمبرائڈری کے رنگین پردے ڈلوا دیے۔ دروازے کے عین مقابل ایک بڑا سا رائٹنگ ٹیبل اور اس کے پیچھے ایک ریوالونگ کرسی رکھوادی۔ اس پر بیٹھ کر دروازے کے باہر لوگوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رہ سکتی تھی۔ داہنی طرف، جہاں کھڑکیاں تھیں، وہاں میں نے چار کرسیاں رکھوا دیں جبکہ اس کے مقابل دیوار کے ساتھ ایک خوبصورت صوفہ سیٹ رکھوادیا۔ اس کے اوپر دیوار کی عین وسط میں راشٹر پتا مہاتما گاندھی کا

ڈیڑھ فٹ بائی دو فٹ فوٹو ایسے لٹکوا دیا کہ وہ دیوار کے ساتھ تیس درجے کا زاویہ بنانے لگا۔ رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بھی مہمانوں کے لیے مزید دو کرسیاں رکھوا دیں۔

کمرے کی کھڑکیوں کے دو تین کانچ ٹوٹے ہوئے تھے۔ اکثر گرد آلود گرم ہوا ان سوراخوں سے گھس کر میرے چہرے پر ٹکورے لگاتی تھی۔ چنانچہ ابھی بہت سارے اہم کام پڑے ہوئے تھے اس لیے میں نے ان کو نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔

کھڑکیوں کے باہر کا نظارہ بڑا ہی دلسوز تھا۔ پٹڑیوں کی پرلی طرف اُوسر زمین کا بہت بڑا خطہ افق سے جا ملتا تھا۔ اس بنجر زمین پر جگہ جگہ ببول اور ناگ پھنی کے پیڑ اگے تھے جن کے سائے میں مریل گائیں اور جھلسی بھینسیں بیٹھ کر جگالی کیا کرتی تھیں۔ صبح تڑکے جھگی جھونپڑیوں کے غریب نادار بچے انہی پیڑوں کے سائے تلے رفع حاجت کے لیے بیٹھ جاتے۔ بعض اوقات اِکا دُکا لاغر کتے کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں کو اپنے پنجوں سے یوں کریدتے جیسے ان میں کوئی قارون کا خزانہ چھپا ہو۔

پیش منظر بیتے ہوئے کل کے پس منظر سے بالکل الٹ تھا۔ وہاں پیر پنچال کی اُس طرف ہری بھری وادیاں تھیں، برف سے ڈھکے ہوئے نیلے اودے پہاڑ تھے، پرشکوہ چناروں کے سائے تھے، لہراتے بل کھاتے ہوئے جھرنے تھے، آئینہ صفت جھیلیں تھیں، سورج کی حرارت کو کم کرنے والی ٹھنڈی ہوائیں تھیں اور روح کو تازگی بخشنے والا چشمہ شاہی کا شفاف پانی تھا۔ اس کے برعکس یہاں تپتی پیاسی بنجر زمین تھی، بادلوں کے لیے ترستا آسمان تھا، اوپر دہکتا ہوا سورج تھا اور نیچے لُو کی آنچ میں جھلستی زندگی تھی۔ بالکل دوسری دنیا تھی یہ۔

ایک روز میں یونہی اپنی کرسی پر بیٹھا خیالات میں غرق مسلسل کھڑکی کے باہر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک چھوٹی سی خاکستری رنگ کی چڑیا نیلے آکاش سے پری کی مانند اُتر آئی اور کھڑکی کی چوکھٹ پر اس جگہ بیٹھ گئی جہاں کانچ ٹوٹی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر دم لے کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اپنے پر جھاڑے اور پھدک کر مہاتما گاندھی کے فوٹو پر جا بیٹھی۔ اس کی چونچ میں سوکھی گھاس کا ایک لمبا سا تنکا تھا جو اس نے نہایت عمدگی اور ہنرمندی سے فوٹو کے پیچھے جمع کر لیا۔ پھر بشاشت سے لوٹ کر کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر کے بعد اس کا ہم صفیر اپنی منقار میں پھونس کا ٹکڑا لیے اُڑتا ہوا چلا آیا اور آہنی چوکھٹ پر چڑیا کی بغل میں بیٹھ گیا۔ چڑے نے پیار بھری نظروں سے اپنی محبوبہ کو دیکھ لیا۔ پھر اُسی

کی تقلید میں پھونس کے ٹکڑے کو فوٹو کی عقب میں جمع کر لیا اور لوٹ کر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں آنکھوں میں دونوں ایک دوسرے کی ستائش کرتے رہے، نہارتے رہے اور چند ہی لمحوں کے بعد پھُر سے اُڑ کر نیلے گگن کی وسعتوں میں کھو گئے۔ وہ منظر دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ محبت کی ایک نظر زندگی کی ساری تھکان مٹا دیتی ہے اور اس کی جگہ تروتازگی عطا کرتی ہے۔ یہ دونوں پکھیرو پیار کا ایک چھوٹا سا مندر بنانے کے واسطے ابھی ابھی سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر کے آئے تھے مگر ایک دوسرے کے التفات کو دیکھ کر دوبارہ لمبی پرواز کے لیے چل پڑے۔

جبلی طور پر ان پرندوں نے آنے والی برسات کی آہٹ سُنی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اب تھوڑے ہی دنوں میں رِم جھِم مینھہ برسنے والا ہے اور ساری فضا پریم رس میں ڈوب جائے گی۔ اس لیے وہ پہلے ہی سے اپنے لیے ایک ایسا نشیمن بنانے میں جٹ گئے جس میں وہ پورے موسم ساتھ نبھاتے، خوراک بٹورتے، دانہ بدلی کرتے اور پھر افزائش نسل کا سامان کرتے۔ مادہ کنجشک انڈے دیتی اور ان کو تب تک سیتی جب تک ان میں سے چھوٹے چھوٹے چینچلے اپنے نازک اور ملائم سر ابھارتے۔ اس درمیان نَر کنجشک نہ صرف اس نشیمن کی جی جان سے رکھوالی کرتا بلکہ اپنی مادہ ہم سفر کے لیے کھانے پینے کا انتظام بھی کرتا۔ پھر دونوں مل کر ان چوزوں کی پرورش کی خاطر صحراؤں اور بیابانوں کی اڑان بھرتے، ان کے لیے چوگا لے آتے اور اُن کو پیار سے کھلاتے۔ پھر ایک دن ایسا بھی آتا کہ ان چینچلوں کے پَر نکل آتے، وہ انہیں پھڑ پھڑانے کی کوشش کرتے اور قوت کا احساس ہوتے ہی پہلی فرصت میں اڑ جاتے۔ یہی ان دونوں کی زندگی کی تکمیل ہوتی اور ان کے خوابوں کی تعبیر بھی۔

دونوں نر اور مادہ میرے کمرے میں برابر آتے جاتے رہے اور اپنی چونچوں میں دبائی ہوئی گھاس پھونس، سوکھی پتیاں، روئی کے گالے اور دیگر پرندوں کے ادھڑے ہوئے زیریں ملائم پَر اپنے گھونسلے میں کمالِ صناعی کے ساتھ جوڑتے رہے۔ انہیں میرے وجود سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میرا ہونا یا نہ ہونا ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھا انہیں پہروں دیکھا کرتا اور ان کے صبر اور کاریگری کی داد دیتا۔ ان دونوں کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جانوروں کے لیے گھر بنانا ایسا ہی جبلی فعل ہے جیسے سانس لینا، پانی پینا یا دانہ کھانا۔

اس واقعے کے بعد میں ہر روز ان دو ننھے منے کاریگروں کو تنکا تنکا جوڑ کر اپنا نشیمن بناتے

دیکھا کرتا۔ وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ اپنی منقاروں میں دور دور سے پوآل کے تنکے اور سوکھی چھال کے مہین ٹکڑے لے کرآتے اور جلاہوں کی مانند اپنے گھونسلے کے تانے بانے بُنتے۔ اس کارروائی کے لیے ان کے پاس ایک ہی آلہ تھا اور وہ تھا اُن کی چونچ۔ گھونسلا بناتے وقت ان چھوٹی سی جانوں میں غضب کا اعتماد اور دور بینی نظر آتی تھی۔ وہ اکثر کھڑکی کی آہنی سلاخوں پر بیٹھ کر اپنے آشیانے کو امید بھری نظروں سے دیکھا کرتے۔ نشیمن کے تصور ہی سے ان کا دل باغ باغ ہو جاتا اور وہ اپنی بھوک اور تھکاوٹ کو بھلا کر دوبارہ تعمیر کے کام میں منہمک ہو جاتے۔ ان کی پرواز کی تیز رفتاری ہی سے ان کی انبساط کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ ان کی لگن اور استقامت کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ نہ صرف انسان بلکہ چرند و پرند بھی ایک خوبصورت آشیانے کے خواب بُنتے ہیں اور اس کی تکمیل کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔

دونوں جُلاہے نہایت صبر وتحمل کے ساتھ گھونسلے کے تار و پود بُنتے رہے۔ انہوں نے سوکھی گھاس کے تنکوں کے ساتھ نرم روئی، حیوانوں کے بال اور جانوروں کے ملائم زیریں پَر اس طرح جڑ دیے کہ گھونسلے کی اندرونی سطح گدگدی سی بن گئی۔ اب وہ اس گھونسلے میں رہنے بھی لگے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی مزید تعمیر وتزئین بھی کرتے رہے۔ کئی بار جب چڑا اور چڑیا اپنے نشیمن کی تعمیر کی خاطر نیلے آکاش کی وسعتوں میں اڑان بھرتے میری نگاہیں ان کا تعاقب کرتیں۔ وہ میلوں اڑتے، درختوں کی پھننگوں پر بیٹھتے، بجلی کی تاروں پر جھولتے یا پھر مکانوں کی چھتوں پر اترتے لیکن جہاں بھی جاتے ان کی نگاہیں ہمیشہ پوآل یا چوگے کی تلاش میں رہتیں۔

بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ان کی موجودگی کا عادی ہو گیا اور اب اُن کو نظر انداز کرنے لگا۔

قدرت نے جلدی ہی ان کی عبادت قبول کر لی۔ آسمان پر کالی بدلیاں چھانے لگیں اور ساتھ ہی ساون کی جھڑی بھی لگ گئی۔ اُدھر جھینگر شور مچانے لگے، اِدھر مینڈک ٹرٹرانے لگے۔ دور آم کے جھنڈ میں پپیہے پی پی کی رٹ لگانے لگے۔ باغوں میں ساون کے جھولے پڑنے لگے اور فضا میں برہ کے گیت گونجنے لگے۔ چڑے اور چڑیا کے دل بھی عشق کی گرمی سے لبریز ہو گئے۔ چڑیا جہاں بھی جاتی، مجنوں چڑا چشم زدن میں وہاں جاکر اس کی بغل میں بیٹھ جاتا۔ چڑا اپنی پھندیت سے چڑیا کو اپنے دام میں پھنسا لیتا۔ دونوں ایک دوسرے کی جانب مقناطیسی قوت سے کھینچے چلے

آتے۔ چونچ سے چونچ لڑاتے۔ چڑا اپنے پنکھ پھلا کر اپنی مردانگی کا رعب جماتا اور دیکھتے ہی دیکھتے چڑیا کو زیر کر لیتا۔ پھر دونوں جوشِ مستی سے سرشار ہو کر دور خلاؤں میں پرواز کرتے۔

کچھ عرصے کے بعد مجھے ہفتے بھر کی چھٹی لینی پڑی۔ سنیچر اور اتوار الگ۔ پورے نو دن میرا کمرہ بند رہا۔ اس دوران میں ان پیاسی روحوں کو بے روک ٹوک اور کھلم کھلا پیار کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ وہ میری عدم موجودگی کا جتنا بھی فائدہ اٹھا سکتے تھے، اٹھالیا۔ ٹوٹے ہوئے کانچ کی بدولت انہیں کمرے میں بے خطر آنے جانے کی اور اپنے نشیمن تک رسائی کی پوری آزادی تھی۔ ان کی نقل و حرکت پر کسی آدم زاد کی نگرانی نہ تھی۔ انہیں ایسا لگا کہ کمرے کا مکیں ہمیشہ کے لیے کمرے کو خیر باد کہہ کر کہیں اور چلا گیا۔ وہ جہاں مرضی بیٹھ جاتے اور جدھر مرضی گتھم گتھا ہو جاتے، سیلنگ فین کے بلیڈوں پر، رائٹنگ ٹیبل کے ٹاپ پر، کرسیوں کے بازوؤں پر یا پھر صوفے کے بیک پر۔ انہوں نے اپنی بیٹ سے قالین، صوفے اور فرنیچر سبھی پر جا بجا گلکاریاں کیں۔ پورے فرش پر خس و خاشاک پھیلا دیا اور نو دنوں میں ہی کمرہ سڑے ہوئے چرکین سے متعفن ہو گیا۔

جس دن چھٹی ختم ہوئی میں معمول سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی دفتر پہنچ گیا۔ دفتر میں چوکیدار اور صفائی کرمچاری کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میں نے چوکیدار کو بلا کر اپنا کمرہ کھلوایا۔ دروازہ کھولتے ہی تیز بدبو نے میرا استقبال کیا۔ دائیں بائیں نظر ڈالی تو ہر جگہ کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا تھا۔ بہر حال اس کو تو میں صاف کروا ہی لیتا مگر قالین اور صوفے کی دُرگت دیکھ کر دل خستہ ہو گیا۔ پیخال کے داغ نکلنا ناممکن تھے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس منظر کو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ رفتہ رفتہ میرا پارہ بڑھتا گیا اور مجھے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں صفائی کرمچاری پر برس پڑا جیسے یہ سارا قصور اسی کا تھا۔

''دیکھو کیا حالت بنائی ہے کمرے کی۔ تم ان دنوں کمرے کی صفائی نہیں کرتے تھے کیا؟''

''سر کمرہ تو بند رہتا تھا۔ آفس سپرانٹنڈنٹ کے پاس چابی نہیں تھی۔ پھر میں اس کی صفائی کیسے کر سکتا تھا؟''

مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تاہم تحکمانہ لہجے میں دوبارہ بول اٹھا:

''دیکھو، سارے کمرے کی صفائی جلدی سے کر لو اور اس فوٹو کے پیچھے بنے ہوئے گھونسلے کو باہر پھینک دو۔ او کے!'' حکم دینے کے فوراً بعد میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑے وقفے کے بعد صفائی کرمچاری میرے پاس آیا اور عاجزی سے کہنے لگا:
''سر، میں اُس گھونسلے کو نہیں پھینک سکتا۔ اس میں چڑیا کے انڈے ہیں۔ وہ ٹوٹ جائیں گے۔ مجھے پاپ لگ جائے گا''۔
اس کا ضمیر اسے کسی ذی روح کا گھر اجاڑنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا جو اس کی صورت اور طرز گفتار سے صاف ظاہر تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں ایسا جوکھم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا۔
صفائی کرمچاری کی نافرمانی کے سبب میرا غصہ اور بھی بھڑک اُٹھا۔
''تم اور تمہارا ابلڈی کانشنس! گھر میں انڈے نہیں کھاتے ہو۔ اُس وقت پاپ نہیں لگتا''۔
میں زور زور سے چلانے لگا۔ پھر خود ہی بڑھ کر فوٹو کے عقب سے گھونسلا نکال لایا اور اس کو کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔
دیکھتے دیکھتے اس نشیمن کا تنکا تنکا بکھر گیا۔ سارے انڈے زمین پر گرتے ہی ٹوٹ گئے اور ان میں سے رقیق مادہ سرعت کے ساتھ بہہ کر سوکھی دھرتی میں جذب ہو گیا۔
چوکیدار اور صفائی کرمچاری دم بخود اس کارروائی کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد میں نے صفائی کرمچاری کو دوبارہ ہدایت دی:
''اب تو کوئی پرابلم نہیں ہے تم کو۔ اس چھوٹی سی بات کو تم نے اتنا بڑا مسئلہ بنایا۔ نو کم آن۔ اب سارے کمرے کی جلدی سے صفائی کرلو''۔
آخر کار کمرے کی صفائی ہوئی اور صفائی کرمچاری نے مجھے اطلاع دی۔ میں خوش ہو کر اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔
ابھی دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ چڑیا اپنے دل میں آرزوؤں کا سمندر سمیٹے اور چونچ میں چوگا دبائے گردوں سے اُتر آئی۔ وہ کھڑکی کی آہنی چوکھٹ پر اُسی جگہ بیٹھ گئی جہاں کانچ ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں امید اور توقع سے چمک رہی تھیں۔ چوکھٹ سے پھدک کر وہ سیدھے فوٹو فریم پر جا بیٹھی۔ فریم کا عقبی منظر دیکھ کر یکایک اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کا گھونسلا کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ہڑبڑاہٹ میں اس کی منقار سے اناج کا دانہ چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ تب بھی اس کو اپنی آنکھوں پر وشواس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اڑی اور اڑتی رہی۔ کمرے میں چاروں طرف اپنے نشیمن کو تلاشتی رہی۔ بارہا وہ اسی فوٹو کی جانب لوٹ آتی اور اس پر منڈلاتی رہتی۔ شاید اجڑے

مسکن کا کہیں کوئی سراغ مل جائے۔

بڑی دیر کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اس کا نشیمن مستقل طور پر اجڑ چکا ہے اور اس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں۔ کہیں بھی کوئی نشان باقی نہیں بچا ہے۔ وہ وحشت سے پاگل ہو گئی اور سارے کمرے میں بے تحاشہ اڑنے لگی۔ کئی بار وہ اس فوٹو کے پاس آ گئی جس فوٹو کے عقب میں اس نے اپنے خواب سجائے تھے۔ وہ اس فوٹو کے ساتھ اپنا سر پٹکتی رہی اور بار ہا اس کے کانچ پر ٹھونگے مارتی رہی جیسے وہی اس کی تباہی کا ذمے دار ہو۔ اس کی چونچ سے عجیب قسم کی درد بھری چیخیں نکل رہی تھیں۔

اُڑتے اُڑتے وہ اچانک تیز رفتار برقی پنکھے سے ٹکرائی۔ اس کے داہنے پنکھ کو زبردست ضرب لگی۔ بے شمار پَر کٹ کر سارے فرش پر بکھر گئے۔ وہ خود بھی دور فرش پر جا گری اور چیں چیں کرتی ہوئی تڑپتی رہی۔ تاہم اس کی دونوں آنکھیں فوٹو کی جانب تک رہی تھیں۔ پھر دم بھر میں وہ سدا کے لیے خاموش ہو گئی۔

دریں اثنا چڑا افرطِ شوق سے مخمور اُڑتا ہوا چلا آیا اور حسبِ معمول کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر پھدک کر فوٹو فریم پر جا بیٹھا۔ فوٹو کے پیچھے جو نظر ڈالی وہاں سکتے کا عالم تھا۔ اس کی ساری خوشیاں پل ہی میں کافور ہو گئیں۔ مڑ کر دیکھا تو اپنی ہمجولی پر نگاہ پڑی۔ اس کی حالت دیکھ کر دل مسوس کر رہ گیا۔ فوراً پھدک کر نیچے اترا اور چڑیا کے مردہ جسم پر یوں منڈلانے لگا گویا وہ اُس سے روٹھ گئی ہو اور چڑا اس کو منانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے کئی بولیاں بولیں، کئی سحر کاریاں آزمائیں لیکن چڑیا کو جاگنا تھا نہ وہ جاگی۔

چڑے کا دل بھر آیا۔ اس کے من میں ہُوک سی اُٹھی۔ وہ بار بار اپنے اجڑے ہوئے نشیمن کی جانب نظریں اٹھاتا اور پھر مایوس ہو کر خود ہی جھکا لیتا۔ دل شکستہ ہو کر وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر جا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

اس کا آشیانہ دہشت کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی ہم نوا ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکی تھی۔ اس کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔

چڑے نے آخری بار مڑ کر اپنے لٹے ہوئے نشیمن پر نظر ڈالی، بڑی کوشش کے بعد پھر سے ہمت مجتمع کی، اپنے پَر جھاڑے اور پھر دور نیلے آسمان میں نہ جانے کہاں کھو گیا۔

●□●

# پہاڑوں کا رومانس

گرمیوں میں پہاڑوں پر چھٹیاں منانے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ سیاحت کے تصور ہی سے پورے وجود پر رومانس چھا جاتا ہے۔ میٹھی سریلی لوریاں سناتی ہوئیں ٹھنڈی ہوائیں، نرم جانفزا دھوپ، جل ترنگ بجاتے ہوئے شفاف جھرنے اور چار سو پھیلے ہرے بھرے چراگاہ۔ اس پر بھی اگر پہاڑی علاقہ کشمیر ہو تو احساس کی شدت اور بھی دوگنی ہو جاتی ہے۔ کشمیر کی وادی پہاڑوں کی شہزادی ہے۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نیلے برفانی پہاڑ، چیڑ اور صنوبر سے ڈھکے ہوئے لامحدود جنگل، لہروں کے مضراب سے ساز بجاتی ہوئیں ندیاں اور اندردھنش کے رنگوں سے سجے ہوئے پھولوں کے تختے عروسِ لالہ زار کے گہنے لگتے ہیں۔

فطرت نے یہاں کے حسن میں بھی اپنی فیاضی کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ حسن صبیح، تیکھے ناک نقشے، ہرنیوں کی چال اور میمنوں جیسی معصومیت۔ کئی سیاح تو یہ سوچ کر چلے آتے ہیں کہ پہاڑوں کی دوشیزائیں انہی پردیسیوں کیلئے سن بلوغ کو پہنچتی ہیں اور ان کے قدم رکھنے کی دیر ہے کہ یہ حسینائیں ان پر اپنی جان وار دیں گی، اشک بہائیں گی، گلے شکوے کریں گی اور پھر ان کے شبستانوں کو مہکائیں گی۔ ان رومانوی تصورات کو فرضی قصے کہانیوں نے جلا دی ہے اور رہی سہی کسر 'برسات' اور 'جب جب پھول کھلے' جیسی فلموں نے پوری کر لی ہے۔ بہر کیف نہ تو تصورات کو بیڑیاں پہنائی جاسکتی ہیں اور نہ ہی خیالات پر پابندیاں لگائی جاسکتی ہیں۔

مارٹن بوچر بھی کشمیر کے بارے میں اپنے دادا اور والد سے بہت کچھ سن چکا تھا۔

"یُو نو دین آئی واز ان کشمیر، اِٹ یوزڈ ٹو بی اے پیراڈائز آن ارتھ"۔ مارٹن بوچر کے دادا جی وادی کی تعریفیں اسی انداز میں کرنے لگتے اور پھر کبھی رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

یہ اُن دنوں کی بات تھی جب انگریزوں کا طوطی بول رہا تھا۔ سارے ہندوستان پر برطانوی

سامراج کا پرچم لہراتا تھا۔ کشمیر کے مہاراجہ ان کے باج گزار تھے۔ مہاراجہ نے موجودہ تعلیمی نظام میں سدھار لانے کے لیے آرنلڈ بوچر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ریذیڈنسی روڈ پر ان کا عالیشان بنگلہ تھا۔ بنگلے میں بیسیوں مرد و زن مختلف کاموں کے لیے تعینات تھے۔ کھانا بنانے کے لیے، پروسنے کے لیے، گھر کی صاف صفائی کے لیے، باغ کی دیکھ ریکھ کے لیے، غرض مختلف کاموں کے لیے الگ الگ عملے مختص تھے۔

''اینڈ یُو نو آئی ہیڈ وَنس فالن اِن لَو'' یہ آرنلڈ کا تکیہ کلام تھا۔ کشمیر کا ذکر کرتے ہی ان کے منہ سے یہ الفاظ اُبل پڑتے، اُن کا چہرہ تمتما اٹھتا اور پھر یکبارگی وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاتے، خلاؤں میں یوں گھورتے مانو اپنے دل میں چھپے رازوں کو کھنگال رہے ہوں یا پھر اس پری پیکر کی شبیہ اپنے ذہن کے پردے پر اُتارنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

آرنلڈ کی آنکھوں میں پچھلے پانچ برسوں سے موتیابند گراہوا تھا۔ کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اپنی معشوقہ کی تصویر پہچاننے میں بھی انہیں دِقّت ہو رہی تھی۔ انہوں نے وہ تصویر خود اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی اور اس کو اپنے نجی کمرے میں لٹکایا تھا۔ مصوری کا شوق انہوں نے بچپن ہی سے پال رکھا تھا۔ جہاں جاتے پہاڑوں، ندی نالوں، کھیت کھلیانوں اور چراگاہوں کی تصویریں بناتے۔ انہیں فطرت سے لگاؤ تھا۔ زندگی میں صرف ایک بار انہوں نے اپنا ہاتھ پورٹریٹ پر آزمایا تھا اور تصویر کے مکمل ہونے پر اس کے نیچے لکھا تھا ''پورٹریٹ آف مائی لَو'' ایک بے حد حسین کشمیری دوشیزہ کی زندہ جاوید تصویر۔ وہ آرنلڈ بوچر کے کینوا س پر ایسے قید ہو چکی تھی جیسے اس نے موت پر بھی فتح حاصل کی ہو۔

وہ کون تھی؟ یہ راز آج تک کوئی نہیں جان سکا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ گھر کے نوکر چاکروں میں سے ایک تھی۔ کئی لوگوں کا ماننا ہے کہ بنگلے کے عقب میں جہلم دریا پر ٹھہرے ہاؤس بوٹوں میں رہتی تھی، کئی لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تصویر محض خیالی ہے۔ ایسی شکل وصورت والی عورت نہ کبھی دیکھی گئی اور نہ ہی آرنلڈ کی زندگی میں کبھی آئی۔ بنگلے کے چوکیدار کا کہنا تھا کہ وہ ہر رات پازیب کی جھنکار سنتا تھا اور کوئی حسین اپسرا نہ جانے کہاں سے اُتر کر صاحب کے شبستان کی طرف بڑھتی چلی جاتی۔ آرنلڈ کی بیوی، اس پری چہرہ کی کھوج میں کئی بار گرمیوں میں کشمیر آئی مگر بہت تلاش وجستجو کے باوجود انہیں کوئی سراغ نہ مل سکا۔ البتہ آرنلڈ نے اس بارے میں کبھی

کسی سے کچھ نہ کہا۔ چہ مہ گوئیاں ہوتی رہیں۔لوگ قیاس آرائیں کرتے رہے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

ایک روز مارٹن نے تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے آرنلڈ سے پوچھنے کی جسارت کی۔

''گرینڈپا، وہائی ڈونٹ یُوٹیل ہُو واز دیٹ بیوٹی؟''

آرنلڈ کو ایسا جھٹکا محسوس ہوا جیسے کسی تیز رفتار گاڑی کو اچانک بریک لگانے سے مسافروں کو محسوس ہوتا ہے۔تب بھی وہ خاموش رہے اور ان کا پوتا ان کے چہرے کے تاثرات پڑھتا رہا۔ آرنلڈ کی پلکوں پر دو شبنمی آنسو نمودار ہوئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی گر جائیں گے لیکن وہ گرے نہیں پلکوں پر ہی سوکھ کر رہ گئے۔

اس کے برعکس آرنلڈ کے بیٹے جیکب کا تجربہ مختلف تھا۔وہ صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں سیاحت کے لیے آتا اور اپنے مکان کے بجائے ہاؤس بوٹ میں رہنا پسند کرتا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہاں رنگ رلیاں منانے کی پوری چھوٹ تھی۔ آزادی سے قبل افلاس و احتیاج کے باعث نہ صرف غریب عورتوں کو شبستانوں میں بلایا جاتا بلکہ تاشوان میں باقاعدہ عشوہ گروں کا بازار سجتا۔ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دب کر عام کشمیری کسان راحت کا سانس بھی نہیں لے پاتا تھا۔وہ جاڑوں میں مزدور بن کر پنجاب کے زرخیز میدانوں میں ذِلّت کی زندگی گزارتا جہاں اُس کو حقارت سے 'ہاتھو' کے نام سے پکارا جاتا۔اس کے باوجود اسے دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بے نظیر کشمیری دوشیزائیں مغلوں، پٹھانوں اور پھر انگریزوں کے حرموں کی زینت بنتی رہیں۔

طلوعِ آزادی کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔حکومتِ وقت نے جاگیرداری اور عصمت فروشی کا خاتمہ کر کے کشمیریوں کا وقار بحال کیا۔ گو تاشوان تواریخ کا حصہ بن گیا پھر بھی سیاحوں کے اذہان میں پہاڑ کا تصور ویسا ہی رہا جیسا پہلے کسی زمانے میں ہوا کرتا تھا۔وہ پھر بھی پہاڑوں کی فضاؤں میں عشرت کا سامان ڈھونڈنے کے لیے جوق در جوق چلے آتے۔

مارٹن نے اپنے والد جیکب سے کئی بار ان کے فتوحات کی کہانیاں سنی تھیں۔ جیکب کشمیر کے حسن کے بارے میں چٹخارے لے لے کر قصے کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ واقعات کو دلچسپ

بنانے کے لیے وہ مبالغہ آمیزی سے کام لیتا۔ سننے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خلد کی حوروں کی کہانیاں سن رہا ہو۔ ان دلیلوں کو سن کر مارٹن اپنے باپ کی مردانگی کا قائل ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ ہنی مون منانے کے لیے وہ بھی کشمیر چلا جائے گا۔

کشمیر سے نکل جانا آرنلڈ بوچر کے لیے خُلد سے نکالے جانے سے کچھ کم نہ تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ یہیں پر مستقل سکونت اختیار کرتا۔ اس کو کشمیر سے اتنا لگاؤ تھا کہ اسی دھرتی میں دفنائے جانے کی آرزو دل میں تھی مگر بدلے ہوئے حالات میں ایسا ممکن نہ تھا۔

اپنے دادا کی آشفتگی کو دیکھ کر مارٹن کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس پری پیکر کا پتہ لگائے جس کو دیکھ کر آرنلڈ اپنی سنگ مرمر جیسی بیوی کو فراموش کرنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ کشمیر کے حسن میں ایسا کیا طلسم ہے کہ اس کے والد ہاؤس بوٹوں میں اپنی محبتیں بانٹتے پھرتے تھے جبکہ اس کی والدہ اپنے بیڈروم کی تاریکیوں میں آٹھ آٹھ آنسو بہایا کرتی تھیں۔

مارٹن کی شادی ہوئی ہنی مون کے لیے کشمیر کی فلائٹ پکڑی اور اس طرح مارٹن کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہوئی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہاں کی آب و ہوا ہی بدل چکی ہے۔ کھیت اور دہقان دونوں جاگ اٹھے تھے۔ سیبوں، اخروٹوں اور باداموں سے ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے ٹرک وادی سے باہر بھیجے جا رہے تھے۔ پامپور کے گرد و نواح بیش قیمت کیسر کے پھولوں سے لہلہا رہے تھے۔ پورے بارہ مہینے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ برف کا منظر دیکھنے اور سکی انگ کرنے کے لیے سیلانی سردیوں میں بھی جوق در جوق چلے آتے تھے۔

مارٹن جونہی ہوائی اڈے پر اترا اس کا خیر مقدم سفاری سوٹ میں ملبوس ایک خوش گفتار نوجوان نے کیا۔ لمبا تڑنگا، گوری جلد، سر کے بال اور جسم کی روئیں بھورے رنگ کی، انگریزی فر فر بولتا تھا۔ اس کے یار دوست اس کو 'انگریزا' کہہ کر پکارتے تھے۔

''ویل کم مسٹر اینڈ مسز مارٹن۔ ویلکم ٹو کشمیر۔ آئی ایم بشیر احمد۔ یو کین کال می بشیرا''، بشیر نے گلدستہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو، مسٹر بشیر۔ تھینک یو'، مارٹن نے جواب دیا۔

بشیر احمد نے انہیں اپنی ٹیکسی میں بٹھایا اور سیدھے اپنے ہاؤس بوٹ 'نیو ہارائزن' میں لے

آیا۔اس سے پہلے مارٹن بچپن میں اپنی ماں کے ہمراہ 'ہارائزن' ہاؤس بوٹ میں رہ چکا تھا۔اب تو بس اس کی دھندلی سی یادیں باقی تھیں۔بشیر کے والد کی رحلت کے بعد وہ ہاؤس بوٹ بشیر کے بڑے بھائی نے سنبھالا تھا جبکہ بشیر احمد نے 'نیو ہارائزن' کے نام سے نیا ہاؤس بوٹ ڈل جھیل میں اُتارا تھا۔ہاؤس بوٹ کسی پانچ ستارہ ہوٹل سے کم نہ تھا۔ڈرائنگ کم ڈائننگ روم، دو بیڈ روم، اٹیچڈ ٹائلٹ، اوپر چھت پر ستانے کے لیے جگہ، ٹیلی ویژن، میوزک سسٹم، وائن کیبنٹ اور ایک چھوٹی سی لائبریری۔مارٹن کی بیوی دیکھ کر حیران ہوگئی۔اس نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ہاؤس بوٹ میں ایسا انتظام ہوسکتا ہے۔

''میرے گرینڈ پا یہاں رہتے تھے۔ریذیڈنسی روڈ پر ہمارا مکان تھا۔میرے پاپا بھی کئی بار یہاں آچکے ہیں''۔

''یس سر، اپنی ماں سے میں نے آپ لوگوں کے بارے میں سنا ہے''۔

''ہاؤ نائس'' مارٹن نے اپنی بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

لوسی نے اعتراف میں سر ہلایا اور بشیر احمد کی طرف کن اکھیوں سے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

جواب میں بشیر احمد بھی مسکرایا۔

مارٹن اور لوسی کی سہاگ رات یادگار رات تھی۔چنانچہ بشیر احمد کو ان کے ہنی مون کی خبر ملی تھی اس لیے اس نے ہاؤس بوٹ کو دُلہن کی طرح سجا دیا تھا۔بیڈ روم کی دیواروں پر چھوٹے رنگین قمقموں کی مالائیں لٹکا دی تھیں۔بیڈ کے ٹھیک سامنے سٹرپ ٹائپ قد آور آئینے لگوائے تھے جن میں سے وہ دونوں اپنے عریاں بدنوں کو ہلکی ہلکی روشنی میں نہار سکتے تھے۔باہر ڈرائنگ روم میں کینڈل لائٹ ڈنر کا انتظام کیا گیا تھا۔مختلف اقسام کی شرابیں وائن کیبنٹ میں سجا کر رکھ دی تھیں۔

دوپہر کے بعد دونوں میاں بیوی ڈل جھیل میں سرف رائڈنگ کرتے رہے۔پھر تھوڑی دیر جھیل میں تیرتے رہے اور سورج ڈھلتے ہی اپنے ہاؤس بوٹ میں لوٹ آئے۔شراب کا مزہ لینے کے لیے دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے چھت پر چڑھ کر آرام کرسیوں پر دراز ہوگئے۔کچھ سمئے کے بعد ساری جھیل پورنماشی کی چاندنی میں نہلانے لگی۔دیر رات انہوں نے موم بتیوں کی روشنی میں ڈنر کھایا اور پھر اپنے بیڈ روم میں جا کر ایک دوسرے کی بانہوں میں رات بھر جھولتے

رہے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ مارٹن اور لوسی نے پہلی بار مخالف جنس کا سامنا کیا ہو۔ مغرب میں شادی سے پہلے جنسی تجربات حاصل کرنا عام سی بات ہے۔ وہ چاہے ایک سے ہو یا انیک سے۔ کنواری لڑکیوں کو 'اولڈ میڈ' کہہ کر ان کی تضحیک کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ہنی مون کی اپنی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ جڑا ایک رومانس ہوتا ہے، ایک قلبی سکون ہوتا ہے۔ جس کی یادیں میاں بیوی اپنے سینوں سے عمر بھر لگائے پھرتے ہیں۔

بہر حال دوسرے روز سے زندگی واپس عام ڈھرے پر آ گئی۔ سہاگ رات تصویروں اور تصورات میں قید ہو چکی تھی اور اب وہی روزمرہ تھا۔ جاگنا، نہانا دھونا، بریک فاسٹ، لنچ، ڈنر اور سونا۔ دن بھر وہ بشیر احمد کے ساتھ آس پاس کے صحت افزا مقامات جیسے گلمرگ، پہلگام، اچھابل، کوکرناگ، ویری ناگ اور سون مرگ کی سیر کرتے اور رات گئے ہاؤس بوٹ میں لوٹ آتے۔

لوسی کو بشیر احمد کی مقناطیسی شخصیت میں دلفریب کشش سی محسوس ہوئی۔ وہ بارہا اس کے قریب جاتی، اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑتی اور پھر بات بات میں اس کی شادی کے بارے میں پوچھ لیتی۔ بشیر احمد جھینپ کر لا جواب ہو جاتا۔ ایک تو شادی کی بات اور وہ بھی پرائی عورت سے! وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

ایک روز لوسی نے سر درد کا بہانہ بنا کر ہاؤس بوٹ ہی میں رہنے پر اصرار کیا۔ مارٹن نے اپنا پروگرام بدل کر اکیلے ہی مقامی شنکر آچاریہ کا مقدس مندر دیکھنے کا ارادہ کر لیا اور بشیر احمد کو ہدایت دی کہ وہ لوسی کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔

سر درد تو خیر بہانہ تھا بشیر احمد کا قرب حاصل کرنے کے لیے۔ لوسی ڈاکٹر کے پاس گئی اور چند ادویات لے کر جلدی واپس آ گئی۔ سفر کے دوران اس کو بشیر احمد کی معصومیت پر ہنسی آ رہی تھی تاہم اس نے اپنا چہرہ سنجیدہ بنائے رکھا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی لوسی نے بشیر احمد کو سر دبانے اور ماتھے پر وِکس ملنے کا حکم دیا۔ بشیر احمد احتیاط سے سر دبانے لگا اور پھر ماتھے پر بام ملتا رہا۔ اس کی نظریں کبھی لوسی کے سینے کی وادیوں میں کھو جاتیں اور کبھی اس کی تڑپتی ہوئی مچھلیوں پر مرکوز ہو جاتیں۔ لوسی اونہہ آنہہ کرتی کبھی اس کا بازو زور سے دبا دیتی اور کبھی اس کی ٹانگ پکڑ لیتی۔ آخر کار بشیر اپنے

مشتعل جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور لوُسی کے سر کے اوپر جھک گیا۔ بشیر احمد نے اپنے پتتے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر چسپاں کر دیے۔ لوُسی نے اس کی حرکتوں کا کھلے بازوؤں سے خیر مقدم کر لیا۔ وہ اس کے ساتھ لپٹ کر بہت دیر تک مچھلی کی طرح تڑپتی رہی۔

بشیر کی زندگی میں اس واقعے نے تلاطم پیدا کر دیا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے لوُسی کے سپنے دیکھنے لگا مگر لوُسی کی قربت زیادہ دیر اس کے نصیب میں نہ تھی۔ مارٹن اور لوُسی صرف دس دن کے لیے وہاں رہے حالانکہ اس قلیل سی مدت میں بھی بشیر اور لوُسی شیر و شکر ہو گئے تھے۔ جاتے وقت ایئرپورٹ پر دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے پرنم تھیں اور دل میں طوفان صدائیں دے رہا تھا۔

دو مہینے بعد بشیر احمد کو لوُسی کا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ مارٹن اور اس کے درمیان طلاق ہو چکی ہے اور وہ جاڑا ختم ہوتے ہی مارچ یا اپریل میں کشمیر آ رہی ہے۔ اس نے بشیر احمد کو یہ بھی لکھا تھا کہ اگر وہ چاہے تو اپنا پاس پورٹ تیار رکھے کیونکہ وہ اسے انگلینڈ لے جانا چاہتی ہے اور اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ پاسپورٹ تیار ہوا۔ لوُسی مارچ کے آخری ایام میں آئی اور بشیر احمد کے ساتھ شادی کر کے اس کو اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئی۔ بشیر احمد نے لیوٹن میں جائیداد خریدنے اور بیچنے کا دھندا شروع کیا جس کا سرمایہ لوُسی نے مہیا کر دیا۔ اب تک بشیر احمد خاصا بڑا ایسٹیٹ ڈیلر بن چکا ہے۔ اس کے گھر میں دو اور روحوں نے جنم لیا ہے۔ ایک کالے بالوں والا لڑکا ہے، نجم اور دوسری بھورے بالوں والی لڑکی، سائیلا۔

ڈل جھیل میں بشیر احمد کی بوڑھی ماں آٹھوں پہر گہری سوچ میں غرق رہتی ہے۔ جیکب، مارٹن اور بشیر احمد کے چہرے اُس کی نگاہوں کے سامنے ہمیشہ گھومتے رہتے ہیں۔ وہ حیران ہے کہ وقت کے پہیے نے کتنی جلدی پورا چکر کاٹ لیا ہے۔

# معصوم علی

نام۔علی اسماعیل عباس، عمر۔بارہ سال۔ ماں باپ کے بارے میں نہ تو ٹیلی ویژن نے کوئی اطلاع دی اور نہ ہی اخبارات نے۔صرف اتنا بتایا کہ مشرقی بغداد کے ضلع دیالہ برج میں اس کا گھر امریکی بمباری کی زد میں آکر تباہ ہو گیا۔باپ، بھائی اور حاملہ ماں۔کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ایک خالہ ساتھ میں رہتی تھیں۔اس کا بھی سارا خاندان ختم ہو گیا۔

یہ تھی اُس دن کی تازہ خبر۔ٹیلی ویژن پر بار بار علی کی تصویر دکھائی جا رہی تھی۔ننھا منا گول مٹول معصوم چہرہ جس پر درد کی شدت کا کساؤ عیاں تھا۔دو بازو وینس کے پتلے کی مانند کہنیوں سے کٹے ہوئے جن پر مرہم پٹی کی گئی تھی۔سر کے اردگرد بینڈ تیج بندھا ہوا تھا۔سارا بدن میزائل کے شراروں سے جھلس چکا تھا۔الکندی اسپتال کے ڈاکٹروں نے اس پر مرہم لگا دیا تھا اور رگٹر سے بچانے کے لیے علی کو خصوصی چوبی کٹہرے میں رکھا تھا۔

اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔مجھے مصلوب یسوع مسیح کی یاد آ گئی۔کسی نے اس کو صلیب سے اتار کر یہاں اسپتال کے بستر پر لٹا دیا تھا۔ایک معصوم بچپن رائیگاں ہو چکا تھا۔ایک غنچہ بن کھلے مرجھا گیا تھا۔کون جانے اس بے مقصد جنگ کے دوران کتنے گھروں کے چراغ بجھ چکے تھے۔

انسانی فطرت کی گھناونی تصویر۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی معرکہ آرائیاں۔طمع راسہ حرف است و ہر سہ تہی۔پھر بھی آدمی حرص و ہوس سے باز نہیں آتا۔میرے اور تیرے کے چکر میں عمر گنواتا ہے اور پھر خالی ہاتھ لوٹ جاتا ہے۔اسی چکر میں قومیں لٹ چکی ہیں۔تہذیبیں نیست و نابود ہو چکی ہیں۔

میں پاس ہی بیٹھے اپنے بچوں کی جانب بار بار دیکھ رہا تھا اور ان کے سراپے کا جائزہ لے رہا تھا۔میں اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ ان کے ہاتھ پاؤں صحیح سلامت ہیں یا نہیں؟ خدا جانے یہ وہم

کیوں کر میرے دل میں گھر کر گیا تھا۔

''پاپا...... یہ لڑکا تو اپاہج ہوگیا۔ اب یہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزارے گا؟'' میری بیٹی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر تشویش کی بے شمار شکنیں ابھر آئی تھیں۔ میری بیوی کی سوالیہ نگاہیں بھی میری طرف اٹھیں۔ وہ بھی اس سوال کا جواب مانگ رہی تھی۔ دونوں مجھ سے یوں جواب طلب کر رہی تھیں گویا یہ سب میرا ہی کیا کرایا ہے۔ انہوں نے مجھے کٹگھرے میں کھڑا کر دیا۔

''ڈیڈ، میرے خیال میں یہ لڑکا مر ہی گیا ہوتا تو بہتر تھا۔ پوور فیلو۔ اب کیسے جی سکے گا بے چارہ''۔ میرے بیٹے کے چہرے سے اس کے اندر کا تذبذب صاف جھلک رہا تھا۔

مجھے چنتا ہو رہی تھی کہ اگلے روز میری کلاس کے طالب علم بھی مجھ سے ایسے ہی بے شمار سوالات پوچھیں گے اور میں لاجواب ہو جاؤں گا۔ انسانی حقوق، یواین او کا رول، امریکہ کی ہٹ دھرمی، باقی دنیا کی بے حسی، بے بسی اور لاچاری۔ اگلے روز مجھے ایک سیمینار میں بھی شرکت کرنی تھی۔ وہاں 'تہذیب یافتہ سوسائٹی اور انسانی حقوق' پر لیکچر دینا تھا۔ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھ پایا۔ ٹیلی ویژن نے یوں باندھ کر رکھ دیا ہے کہ اور کوئی بھی کام کرنے کو جی نہیں کرتا۔

ممکن تھا اگر الجزیرہ ٹیلی ویژن نہ ہوتا تو شاید مغربی چینلز یہ دل دہلانے والے مناظر نہیں دکھاتے۔

علی اسپتال کی چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ وہ گزری ہوئی رات کا منظر یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدھی رات کا وقت۔ ایک زوردار دھماکہ۔ ہر طرف افراتفری کا عالم۔ آناً فاناً چھت اور دیواریں تاش کے پتوں کی مانند گرنے لگیں۔ سیمنٹ کنکریٹ کے سلیب، لوہے کے ستون، اینٹیں، سریا، پلستر۔ سب کچھ گرنے لگا۔ مہیب اندھیروں میں کسی کو کچھ بھی نہیں سوجھا۔ اَجل نے ردعمل کی فرصت ہی کہاں دی۔ ہر طرف سے رونے، چیخنے اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کو بلا رہے تھے مگر کوئی کسی کی آواز نہیں سن پا رہا تھا۔

بابل کا مینار صدیوں بعد پھر اُسی دھرتی پر ڈھے جا رہا تھا۔

علی خوف و دہشت کے مارے ایک کونے میں دبک کر بیٹھا رہا۔ ستون ٹوٹتے رہے، دیواریں گرتی رہیں، سارا مکان ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہوگیا۔ آوازیں ایک ایک کر کے اسی

ملبے میں دب کر رہ گئیں۔

صبح جب نور کی کرنوں نے رات کی ظلمتوں پر غلبہ پایا تو بچے کھچے لوگ حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے ملبے کا معائنہ کیا۔ ملبے کے نیچے سے کسی زخمی روح کے کراہنے کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک جٹ ہو کر ملبہ ہٹایا اور زخمی علی کو برآمد کیا۔ پھر چیختی چلاتی ایمبولنس اس کو الکندی اسپتال لے کر آ گئی۔

میں نے سی این این چینل بدل کر بی بی سی لگا دی۔ چینل کا نمائندہ علی سے سوال کر رہا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں علی نے کہا۔

''مجھے فوجی افسر بننے کا بڑا شوق تھا مگر اب نہیں ہے۔ اب چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر بن جاؤں''۔

اتنی بڑی قربانی دے کر اسے تخریب اور تعمیر کا فرق معلوم ہو چکا تھا مگر اب وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ نہ وہ تخریب کے لائق تھا نہ تعمیر کے۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ بولنے لگا۔

''مگر میں اب ڈاکٹر بھی تو نہیں بن سکتا۔ میرے تو دونوں بازو کٹ گئے ہیں۔'' اس کے چہرے پر مایوسی اور بے بسی تھی۔ وہ بغل میں کھڑے ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

''ڈاکٹر انکل، میں نے سنا ہے کہ آج کل مصنوعی بازو بھی لگائے جاتے ہیں۔ کیا آپ مجھے مصنوعی بازو لگائیں گے؟ اگر میرے بازو نہیں ہوں گے تو میں کام کیسے کروں گا؟'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ شاید اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ کچھ وقفے کے بعد وہ الثانی بی بی سی کے نمائندے سے پوچھنے لگا۔

''انکل، آپ ہم لوگوں پر بمباری کیوں کرتے ہیں؟''

انگریز نمائندے کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں اور نرسوں کے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ سوال ہوا میں تحلیل ہو کر مستقبل کے لیے محفوظ ہو گیا۔

انٹرویو ختم ہو چکا تھا۔ میں نے پھر سے سی این این چینل لگا دی۔ امریکہ کا صدر لیکچر دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ عراق کی آزادی میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ البتہ آزادی حاصل کرنے کے لیے کچھ تو قربانیاں دینی ہی پڑتی ہیں۔

میرے بچے لیکچر سن کر مشتعل ہو گئے۔ ''ظالم کہیں کا! اپنے بچوں پر گزری ہوتی تو سمجھ میں آتا کہ قربانی کیا ہوتی ہے؟'' وہ صدر بش کو کوسنے لگے۔

''پاپا، ایسی آزادی کس کام کی جس میں ہزاروں بے گناہوں کی جانیں تلف ہوں۔ کتنے سارے معصوم بچے اپاہج ہو گئے۔ اس آزادی سے تو غلامی ہی بہتر ہے''۔ میرے بیٹے نے اپنی رائے دی۔

''ہاں پاپا۔ پھر بھی کون سی گارنٹی ہے کہ وہاں کی غریب عوام کو آزادی سے جینے کا حق حاصل ہوگا''۔ بیٹی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

میں ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف تھا۔ کوئی جواب نہیں دے پایا۔

اُدھر صدر بش کی آواز گونج رہی تھی ''ہم نے ڈکٹیٹر صدام حسین کا خاتمہ کر دیا اور اب عراق میں جمہوریت بحال کرنا چاہتے ہیں''۔

''دنیا میں صدام حسین ہی ایک ڈکٹیٹر تو نہیں ہے۔ کتنے سارے ممالک ہیں جہاں جمہوری نظام نہیں ہے۔ نارتھ کوریا، پاکستان، سعودی عربیہ، چین اور پھر واٹیکان بھی تو...... امریکہ ان ممالک پر حملہ کیوں نہیں کرتا؟'' میرے بیٹے نے سوال کیا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور انہماک سے ٹی وی دیکھتا رہا۔ خود کو اَپ ڈیٹ کرنا میرے روز کا معمول بن چکا ہے۔ میں نے پھر سے چینل بدل دی۔

اس وقت بھی علی کی لائیو تصویریں دکھائی جا رہی تھیں۔ وہ اسپتال کی چھت کو بدستور ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ وہ خلاؤں میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وارڈ میں ہر آنے جانے والے کی آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس کی بے بس نگاہیں ہر ایک سے التجا کر رہی تھیں ''ذرا ملبے میں غور سے ڈھونڈ لو۔ شاید میرے ماں باپ ابھی زندہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہوں گے۔ وہ مجھے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جائیں گے''۔

چند روز بعد صدام حسین کا بت گرایا گیا۔ ابھی صدام حسین ملا نہیں تھا اس لیے اس کے بت ہی سے انتقام کی آگ بجھائی جا رہی تھی۔ امریکی فوجی بہت خوش نظر آ رہے تھے اور وہ لوگ بھی جو کبھی صدام حسین کے مظالم کا شکار ہوئے تھے۔ وہ صدام کے بت پر جوتے مار رہے تھے۔ انتقام کا جذبہ بھی کتنا سنگین ہوتا ہے۔ اس وقت کسی کو گمان بھی نہ گزرا تھا کہ امریکہ صدام حسین کو

زندہ پکڑ پائے گا۔

ادھر نجف اور کربلا سے ابھی بھی چھٹ پٹ گھٹناؤں کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔قومِ سادات کا لہو آج بھی بہہ رہا تھا۔

نہ نیوکلیر بم ملے اور نہ ہی نیوکلیائی ری ایکٹر۔نہ کیمیائی اسلحہ ملا اور نہ ہی جنگ کا جواز۔جواز کا تو بہر حال کوئی مسئلہ نہیں تھا۔آدمی انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے کیے کا جواز ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔خواہ اس کا فعل صحیح رہا ہو یا غلط۔انسانیت افزاء ہو یا انسانیت کُش۔جواز ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔صدر بش بھی اپنی اس کارروائی کا جواز ڈھونڈ ہی لے گا۔

میری بیوی مجھے پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہے۔شاید کہنا چاہتی ہے کہ تم بھی صدر بش سے کچھ کم نہیں' ہو۔تم بھی اپنے برے کاموں پر پردہ ڈالنے کے لیے لمبی لمبی تقریریں جھاڑتے ہو۔ میں تو مجبور ہوں۔یقین نہ ہوتے ہوئے بھی یقین کر لیتی ہوں۔

چند ہی روز میں لوٹ کھسوٹ کا بازار بھی گرم ہو چکا تھا۔لوگ کتنی جلدی اپنی مصیبتیں بھول جاتے ہیں۔الاماں! کتنی بڑی بڑی عالیشان عمارتیں ڈھ گئیں۔مضبوط ترین مجسمے مسمار ہو گئے۔جو کل تھا وہ آج نہیں ہے۔لوگ مردوں کی چھوڑی ہوئی جائیدادیں لوٹ لوٹ کر اپنے گھر بسانے لگے تھے۔لوہے کی الماریاں، لکڑی کا فرنیچر، فریج، واشنگ مشینیں، پنکھے اور بھی بہت کچھ۔مجھے ان افعال پر ہنسی آ رہی تھی۔ان لوگوں کو کیسے معلوم تھا کہ وہ دوسرے پل جی بھی رہے ہوں گے یا نہیں۔

پرانی قبروں پر نئے تاج محل کھڑے ہو رہے تھے۔

رفتہ رفتہ سبھی لوگ علی کو بھول گئے۔ٹیلی ویژن چینل بھی اور اخبارات بھی۔وہ بیچارہ بدستور اسپتال میں اپنی زندگی کی لڑائی لڑ رہا تھا۔اکیلے بالکل اکیلے۔اس کو یاد آ رہا تھا کہ پچھلے سال اس کے جنم دن پر جشن منایا گیا تھا۔اس کے والدین، رشتے دار اور دوست احباب سبھی جمع ہو چکے تھے۔اس کے والدین نے بڑے کمرے کو خوب سجایا تھا۔قمقمے، غبارے، بنٹنگ، کیک اور موم بتیاں۔اس نے بارہ موم بتیاں بجھا دی تھیں۔پھر کیک کاٹ کر اپنے ہاتھ سے ماں باپ کو کھلایا تھا۔

غیر ارادی طور پر علی نے اپنے داہنے بازو کو حرکت دینے کی کوشش کی۔وہ چند ساعتوں کے لیے یہ بھول گیا کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔محض دو ٹھنٹھ اور کچھ بھی نہیں۔اس خیال سے شاید وہ رو

لیتا لیکن آنسوؤں کے سوتے بھی خشک ہو چکے تھے گو جسم میں ابھی بھی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

اُسے یاد آیا کہ ہر صبح اس کے ابا وضو کر کے نماز ادا کرتے اور وہ خود بھی ان کے سامنے قرآن پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتا۔ رحل پر رکھے قرآن کے اوراق اپنے داہنے ہاتھ سے اُلٹتا رہتا۔ انہی یادوں میں کھو کر اس نے ایک بار پھر اپنے داہنے بازو کو جنبش دینے کی کوشش کی۔ اس کے منہ سے زوردار چیخ نکل پڑی۔

ڈاکٹر اور نرسیں اس کے اردگرد جمع ہو گئیں۔

''بیٹے، کوئی برا خواب دیکھا کیا؟'' ڈاکٹر نے پیار سے علی کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا:

''انکل، خواب تھا یا حقیقت، مجھے نہیں معلوم۔ البتہ ڈر بہت لگ رہا تھا''۔ علی نے عاجزی سے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے سامنے کھڑی نرس کو ہدایت دی کہ مریض کو جلدی سے پین کلر انجکشن لگا دے۔

علی نے اس کی ہدایت سن لی اور ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

''انکل، کل صبح تو پھر آنکھ کھلے گی۔ درد تو دور نہیں ہو گا ناں''

''بیٹے، ہم بازو تو نہیں لوٹا سکتے ہیں مگر کچھ دیر کے لیے درد کی شدت تو کم کر سکتے ہیں''۔

آج پھر ٹیلی ویژن پر اُس پایۂ ستون کی تصویر دکھائی جا رہی تھی جس پر کبھی صدام حسین کا آہنی مجسمہ کھڑا ہوا کرتا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ پنکھ لگا کر الکندی اسپتال پہنچ جاؤں اور علی کو گود میں اٹھا کر اس پایۂ ستون پر اسی حالت میں ہمیشہ کے لیے کھڑا کر دوں اور اس کے نیچے جلی حرف میں لکھ دوں:

''کیا میں آزاد ہوں......؟''

●□●

# کئی گاندھی اور

''بھئی، آج تو گاندھی جی نے کمال کر دیا۔ کہہ رہے تھے کہ انگریز ہم پر کتنا ہی ظلم کیوں نہ کریں، گولیاں چلائیں، لاٹھیاں برسائیں مگر ہم نہ تو اپنا ستیہ گرہ چھوڑیں گے اور نہ ہی تشدّد پر اتر آئیں گے۔'' پنڈت گرجا شنکر نے مسکرا کر کہا۔

''سچ بابو جی، مجھے تو ان کی باتیں ہی سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ انگریج ہم پر گولیاں برسائیں، لاٹھیاں چلائیں اور ہم دیکھتے رہیں۔ کچھ بھی نہ کریں۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ آخر انسان ہیں۔ موت کا ڈر تو ہر کسی کو لگا رہتا ہے۔ اور پھر ایسا کرنے سے انگریج ہمیں کیوں کر آزادی دینے لگیں۔ اپنی تو کھوپڑی میں کچھ بھی نہیں گھستا ہے۔'' ہری رام گرجا شنکر کے گالوں پر صابن مل کر اب استرے سے ڈاڑھی صاف کر رہا تھا۔ ''دیکھیے بابو جی، سمجھ لیجیے یہ استرا انگریج ہے اور ڈاڑھی ہم لوگ۔ اب یہ ڈاڑھی کے بال چپ چاپ بیٹھے ہیں اور استرا ان کی صفائی کر رہا ہے۔ انجام کار صفایا تو ڈاڑھی کا ہی ہوا نا۔ استرے کا کیا بگڑا۔''

ہری رام نے اتنے بڑے مسئلے کو بڑی سادگی سے بیان کیا لیکن گرجا شنکر نے اسے جستہ جستہ گاندھیائی اصولوں کے بارے میں کافی کچھ سمجھا دیا۔ گرجا شنکر جب بھی اس کی دُکان پر آتا، ہری رام ہمہ تن گوش ہو کر اس کی باتوں کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا، سوال کرتا، جواب سنتا اور آخر میں مطمئن ہو کر چپ ہو جاتا۔

ہری رام نے پانچویں کلاس پاس کر کے تعلیم ترک کر لی تھی اور اس کے بعد ہی اپنے باپ سے موروثی ہنر سیکھ لیا تھا۔ آگے تعلیم پانا نہ تو اس کے بس کی بات تھی اور نہ ہی اس کے پیشے کی ضرورت۔ بس ایک روز یوں ہی تعلیم سے جی اوب گیا، اسکول سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے باپ کی دکان پر جا بیٹھا۔ البتہ خریداروں کی گزر اوقات کے لیے دکان پر جو دو تین اخبارات آتے تھے انہیں وہ خالی اوقات میں لفظ بہ لفظ چاٹ لیتا۔

اس چھوٹی سی دکان پر وہ دن بھر لوگوں کے حجامت بناتا۔ دکان میں اس نے ہیئر ڈریسنگ اور شیونگ کا سارا سامان سجا رکھا تھا۔ حجامت کے لیے دو مخصوص کرسیاں تھی جو اس کے پردادا نے شہر سے خرید لائی تھیں۔ اس کے علاوہ ہیئر کٹنگ مشینیں، برش، کنگھے، قینچیاں، شیونگ صابن، پھٹکری، پانی چھڑکنے کی بوتلیں، ڈیٹول اور بھی نہ جانے کیا الم غلم چیزیں سجا رکھی تھیں۔ ان میں سے کچھ استعمال کے لیے تھیں اور باقی ماندہ محض نمائش کے لیے رکھی گئی تھیں۔ کرسیوں کے سامنے دیوار پر ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا جس کے عین مقابل پچھلی دیوار پر ایک اور آئینہ چھت کے ساتھ زاویہ بناتا ٹنگا تھا۔ سامنے والے آئینے میں چہرہ نظر آتا تھا جبکہ پیچھے والے آئینے میں سر کا پچھلا حصہ نظر آتا تھا۔ دونوں آئینے اس طریقے سے لگے ہوئے تھے کہ عکس در عکس ایک قطار سی بن جاتی تھی۔ باقی دیواریں فلمی ایکٹروں، ایکٹرسوں اور ہیئر اسٹائل کے پوسٹروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ بائیں جانب ایک چھوٹی سی مندر نما الماری تھی جس میں چند دیوی دیوتاؤں کی تصویریں تھیں۔ ہری رام دکان کھولتے ہی ان کے سامنے دھوپ اور اگر بتی جلا کر رکھ دیتا تھا۔

دکان میں حجامت کے لیے جو دو کرسیاں تھیں، ان میں سے ایک کے پیچھے باپ کھڑا کام کرتا اور دوسری کے پیچھے بیٹا۔ جب باپ مر جاتا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا لے لیتا اور پھر خالی کرسی کو پوتا سنبھال لیتا۔ لیکن گاندھی جی کی تعلیم سے متاثر ہو کر ہری رام نے یہ پرمپرا توڑ دی۔ اس کے دونوں بیٹوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی۔ ایک وکیل بن بیٹھا اور دوسرا سیکنڈری اسکول کا استاد۔ دکان کی دوسری کرسی کو سنبھالنے کے لیے ہری رام نے ایک یتیم بے سہارا ہریجن لڑکے کو چن لیا۔

گھر میں جس سے دیکھو گاندھی کے اصولوں کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ بحث و مباحثے ہوتے، اعتراضات ہوتے، سوال و جواب ہوتے۔ اس کے باوجود ہر کوئی گاندھی کو ہی نجات دہندہ سمجھ لیتا۔ گھر میں جہاں تہاں گاندھی، نہرو، پٹیل اور آزاد کے فوٹو لٹکے رہتے تھے۔

جن دنوں گاندھی جی نے ساری قوم کو بدیشی سامان کا بائیکاٹ کرنے کا مشورہ دیا اور صرف سودیشی کپڑے اور سامان خریدنے کی صلاح دی، ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں بدیسی کپڑوں کے الاؤ جلائے گئے۔ لوگوں نے سڑکوں پر مظاہرے کیے۔ ایسے ہی ایک مظاہرے میں ہری رام

نے اپنا بڑا بیٹا کھو دیا۔ وہ بدیسی کپڑے جلانے کی مہم میں زور وشور سے حصہ لے رہا تھا کہ پیچھے سے برٹش پولیس نے اندھا دھند لاٹھی چارج کر لیا جس کی زد میں اس کا بیٹا بھی آ گیا۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس نے باپ کی گود میں دم توڑ دیا۔

بڑے بیٹے کی موت سے ہری رام کی کمر ٹوٹ گئی لیکن پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس کی نظروں میں دیش کے لیے یہ بلیدان اس کی طرف سے ایک معمولی سی بھینٹ تھی۔ وہ اپنے محاذ پر ڈٹا رہا۔ اس نے اپنی دکان اپنے شاگرد کے حوالے کر کے اپنا سارا وقت سماج سدھار اور جن جاگرن میں صرف کیا۔ اپنے طبقے کو احساس کمتری و کمیابی سے نکالنا، بال ودھواؤں کی دوبارہ شادیاں کروانا، کم سن بچوں خاص کر لڑکیوں میں تعلیم کو فروغ دینا اور شرابی مردوں کے ظلم وستم سے بے بس عورتوں کو بچانا اس کی زندگی کا منصب بن گیا۔

ادھر اس کے چھوٹے بیٹے نے سول نافرمانی کے دوران نوکری سے استعفیٰ دے کر بے روزگاری کو گلے لگا لیا۔ موروثی کام تو آتا نہیں تھا اس لیے سبھی آمدنی کے ذرائع بند ہو گئے۔ گھر کی حالت روز بروز پتلی ہوتی جا رہی تھی۔ البتہ گرم خون ابھی بھی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر روپوش ہو گیا۔

پھر کہیں سے خبر ملی وہ گرم دل میں شامل ہو چکا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ آزاد ہند فوج میں شامل ہونے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔ سچائی کی کسی کو خبر نہ تھی۔ کچھ مدت کے بعد کسی نے اڑتی ہوئی خبر سنائی کہ وہ بم بناتے ہوئے پکڑا گیا جبکہ کسی اور شخص نے بتایا کہ ڈی ایم پر جس گروہ نے گولیاں چلائی وہ اس گروہ میں شامل تھا اور پولیس اس کی تلاش میں پھر رہی ہے۔ آخری بار یہ خبر ملی کہ اسے کالا پانی بھیج دیا گیا ہے۔ ہری رام کو ان خبروں سے پریشانی تو ضرور ہوتی رہی مگر حیرانی بالکل نہ ہوئی۔ وہ صرف اس بات پر پشیمان تھا کہ تعلیم میں کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی جس کے سبب اس کا بیٹا گاندھیائی ڈگر چھوڑ کر ایسے لوگوں سے جا ملا۔ ہری رام کو پورا وشواس تھا کہ اس کا ملک عدم تشدد کے راستے پر چل کر ایک روز ضرور آزاد ہوگا۔ وہ دل میں ایمان کا تقدس لیے ثابت قدم اور بے لوث اپنے راستے پر گامزن رہا۔ ہری رام ہمیشہ پارٹی ورکروں سے گھرا رہتا۔ اسے نہ گھر کی فکر تھی اور نہ ہی اپنے پیشے کی۔ کون مرا اور کون جیا، ان باتوں سے اس کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اور پھر اس گھر میں رہا ہی کیا تھا۔ لے دے کے ایک سوکھی پنجر سی بیوی سُکھیا تھی جو چڑیا کی مانند

دو چار دانے چگ لیتی تھی۔ بیٹوں کے غم نے اس کو نڈھال کر دیا تھا مگر اس کا اظہار کرنے سے اس لیے ڈرتی تھی کہ کہیں اس کے سوامی کو لوگ بزدل نہ سمجھ لیں۔

خود ساختہ امیج کو بنائے رکھنے کے لیے انسان کو اپنے دل پر پتھر رکھنا ہی پڑتا ہے۔ پھر ایک روز افق پر آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ نہ انگریزوں کی حکومت رہی اور نہ ہی ان کی بیڑیاں۔ نہ ستیہ گرہ اور نہ ہی وہ آندولن۔ ہوا میں ہر طرف آزادی کی خوشبوئیں مہکنے لگیں۔

انگلیوں پر خون مل کر موقع پرست اپنے بلوں سے باہر نکل کر بڑی بڑی قربانیوں کے دعوے کرنے لگے۔ جس کسی کو کہیں پر بھی اقتدار کی خالی کرسی دکھائی دی، جھٹ اس پر قابض ہو گیا۔ ہری رام بے بسی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ یہ ہوڑ کس لیے مچی تھی اس کے اِدراک سے باہر تھا۔ وہ ابھی بھی لوگوں کو سادہ اور ایماندار زندگی گزارنے کا درس دے رہا تھا، جبکہ نئے رہنما انہیں طرح طرح کے جھوٹے سپنے دکھا رہے تھے۔

لوگ دھیرے دھیرے ہری رام کو چھوڑ کر دوسرے نیتاؤں کے پیچھے بھاگنے لگے۔ انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ ہری رام کے پیچھے بھاگنے سے انہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ جو آدمی اپنا بھلا نہیں کر سکتا وہ دوسروں کا کیا بھلا کر سکے گا۔ آدرستکار میں کمی تو نہیں آئی مگر معتقدوں کی بھیڑ روز بروز گھٹتی چلی گئی اور پھر ایسا وقت بھی آیا کہ ہری رام کو اپنے پیچھے صرف اپنا سایہ نظر آنے لگا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے گھر میں ایک معذور بیوی ہے اور کوئی نہیں۔ بڑا بیٹا تو بھگوان کو پیارا ہو گیا تھا اور دوسرے کی کوئی خیر خبر نہ ملی۔ حکومت نے سبھی سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا تھا۔ سیلولر جیل کے دروازے کب کے کھول دیے گئے تھے مگر اس کا بیٹا واپس نہیں آیا۔ بہت انتظار کرنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اس کا دوسرا بیٹا بھی دنیا سے کوچ کر گیا ہوگا۔

ہری رام کی آنکھیں کھلیں تو اسے اپنی دکان یاد آئی۔ اسے گاندھی جی کا وہ قول یاد آیا کہ دنیا میں کوئی کام اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ خلوص کے ساتھ اپنا کام کرنا ہی انسان کا سب سے بڑا دھرم ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ دوبارہ اپنے موروثی کام کو سنبھالے گا۔ دوسری صبح جب وہ دکان پر پہنچا تو اس کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس کی دکان اور اس سے ملحق ساری دکانوں کو مسمار کرنے کے لیے بلڈوزر تیار کھڑے تھے۔ ان کی جگہ عالیشان مال بننے جا رہا تھا۔ ہری رام سکتے میں آ گیا۔ اس دکان پر اس کی تین پیڑھیوں نے لوگوں کی خدمت کی تھی پھر بلڈر اس

طرح انہیں بے دخل کیسے کرسکتا تھا؟ ہری رام بلڈر سے بات کرنے چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ مقامی ممبر پارلیمنٹ کا بیٹا لکشمن سنگھ ہے۔ بڑے ہی پیار اور نرم لہجے سے وہ لکشمن سنگھ کو سمجھانے لگا کہ اس کا یہ طریقہ غلط ہے اور یہ دکان ہری رام کی ہے۔ وہ اجازت کے بغیر دکان کو مسمار نہیں کرسکتا۔

لکشمن سنگھ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کو اپنی طاقت کا بخوبی اندازہ تھا۔ اس نے بڑی ہی رکھائی سے جواب دیا۔

''آپ کو جو کرنا ہے کرلیجیے۔ بلڈوزر تو چل کر ہی رہیں گے۔ انہیں دنیا کی کوئی بھی طاقت نہیں روک سکتی۔''

ایسا روکھا جواب سن کر ہری رام نے ستیہ گرہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ وہ تب تک دکان کے سامنے سے نہیں ہٹے گا جب تک بلڈوزر وہاں سے واپس نہیں جائیں گے۔ اس نے کھانا پینا سب ترک کرلیا۔

ایک دن......دو دن......تین دن......! اِکے دُکے لوگ آتے رہے، اسے دیکھتے رہے اور ہمدردی ظاہر کرکے آنکھوں سے اوجھل ہوتے رہے۔ اس نے سوچا تھا کہ دوسرے دکاندار بھی اس کا ساتھ دیں گے اور بلڈر کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کریں گے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ دوسرا کوئی بھی شخص برت رکھنے کے لیے اس کے ساتھ نہیں بیٹھا۔ نہ بھیڑ جمع ہوئی اور نہ ہی اخباروں میں خبریں چھپیں۔

لکشمن سنگھ سے لوہا لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس کے غنڈے اور کارندے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ جو کوئی بھی تھوڑی بہت ہمدردی جتاتا، سورج ڈوبتے ہی اس کو چیتاونی مل جاتی۔ تین روز کے بعد لکشمن سنگھ کو لگا کہ معاملہ طول پکڑتا جارہا ہے۔ اسی رات اندھیرے کی آڑ میں لکشمن سنگھ کے غنڈوں نے ہری رام کو اغوا کرلیا اور زدوکوب کرکے پاس ہی مندر کی سیڑھیوں کے سامنے ادھ مرا چھوڑ دیا۔ صبح سویرے جب پجاری کی نظر اس پر پڑی، اس نے فوراً ہری رام کی نبض ٹٹولی، رکشا منگوایا اور سیدھے اسپتال کا رخ کرلیا۔ ہوش آنے کے بعد ہری رام پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر درج کرانے کی خاطر چلا گیا لیکن وہاں پر کوئی بھی شخص پرچہ چاک کرنے کو تیار نہ تھا۔ اسے طرح طرح کے بالواسطہ اور بلاواسطہ سوال کیے جارہے تھے

اور یہ باور کرنے کی کوشش کی جارہی تھی کہ اس کیس میں کوئی دم نہیں ہے کیونکہ نہ تو کوئی چشم دید گواہ موجود ہے اور نہ ہی قرائینی شہادت۔

ہری رام کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔اس نے من ہی من سوچ لیا۔''ہے رام، ایسا انیائے تو انگریجوں کے زمانے میں بھی نہیں ہوتا تھا۔'' وہ بے زار اور مایوس اپنے گھر لوٹ آیا۔

سُکھیا نے جونہی ہری رام کی حالت دیکھی وہ اپنی چھاتی پر دوہتڑ مارنے لگی۔ایسا دردناک منظر تو اس نے آزادی سے پہلے کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔اس نے دھیرے سے ہری رام کو چارپائی پر لٹا دیا اور اس کی تیمارداری میں جٹ گئی۔

ہری رام اور سُکھیا اپنا درد سینے میں چھپائے اب اسی انتظار میں تھے کہ کب اوپر والے کا بلاوا آئے گا اور وہ اپنے بیٹوں سے جاملیں گے۔انہوں نے اپنی قربانیوں کا نہ تو گن گان ہی کیا اور نہ کسی کے سامنے ان کا واسطہ دینے کی کوشش کی۔البتہ جو ہو رہا تھا اس سے ہری رام ہرگز مطمئن نہ تھا۔اس کا گاندھی واداب کھلے عام داؤ پر لگا ہوا تھا۔تھک ہار کر وہ ایک شب اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

''اچھا ہوا جو گاندھی جی جلدی ہی بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ان سے یہ منظر نہیں دیکھے جاتے۔''

جواب نہ پاکر اسے تھوڑی بہت تشویش ضرور ہوئی مگر جلدی ہی اس نے سُکھیا کا بازو پکڑ کر زور سے ہلایا۔

سُکھیا ہڑبڑا کر بولی۔''اونہہ، کیا ہوا جی؟رات گئے کیا بڑبڑ لگا رکھی ہے؟سوتے کیوں نہیں؟''

''سُکھی، مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''کیا بات ہے؟اتنی رات گئے آپ کو کیا سوجھی ہے؟'' وہ اٹھ بیٹھی۔

''سُکھی، میرا دل گھبرا رہا ہے۔مجھے اپنے بیٹوں کی یاد آرہی ہے۔مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ان کی قربانیاں رائیگاں ہو چکی ہیں۔تمہیں نہیں لگتا ہے کہ اس دنیا میں میں ہی ایک اکیلا آدمی ہوں جس نے سب کچھ کھویا اور پایا کچھ بھی نہیں۔''

''سنو جی، مجھے آپ کی یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔میں رہی ان پڑھ گنوار۔جو کہنا ہے

صاف صاف کہہ دو۔''

''میں کہہ رہا تھا کہ اچھا ہوا جو گاندھی جی جلدی ہی بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ ان سے یہ منظر نہیں دیکھے جاتے۔''

''بھلا کون سے منظر؟'' سُکھیا نے آنکھیں موندتے ہوئے استفسار کیا۔

''یہی دیش کا بلاتکار، لوٹ کھسوٹ، غنڈہ گردی، توڑ پھوڑ کی راج نیتی......! ایسے بھارت ورش کا تو اُنہوں نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا ہو گا!''

''اب اگر آپ کو یہ کام نہیں آتے تو اس میں دوسروں کا کیا دوش۔ انہیں جو کرنا ہے سو تو وہ کر کے ہی رہیں گے۔''

''سُکھی، تم کیوں نہیں سمجھتی ہم تو سب کچھ کھو بیٹھے۔ ایک بیٹا آنکھوں کے سامنے مارا گیا، دوسرا نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ خود گاندھی جی نے بھی اتنے کشٹ نہیں جھیلے ہوں گے۔ میں اپنے دیش سے اپنی قربانیوں کی قیمت نہیں مانگ رہا ہوں۔ مگر یہ اَپمان ...... یہ ترسکار...... یہ سب کچھ سہہ نہیں سکتا۔ چند غنڈوں کے ہاتھوں ہمیں اتنا اپمانت ہونا پڑے گا اور پولیس تماشائی بنی بیٹھی رہے گی، ایسا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔''

''بھگوان کی جو مرضی تھی سو ہو گیا۔ اس میں ہم نِربل انسان کیا کر سکتے ہیں۔''

''سُکھی، کیا میں نے ان لوگوں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ اب تو لوگ مجھ کو دیکھ کر کنی کاٹ لیتے ہیں۔ نظریں پھیر لیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے اب اس دیش کو نہ میری اور نہ ہی میرے آدرشوں کی ضرورت ہے۔''

''اجی، چھوڑ دو ان باتوں کو۔ اس دنیا میں سب مطلب پرست ہیں۔ چڑھتے سورج کو پوجتے ہیں۔ پھر ہم ڈوبتوں کو کون پوچھے گا۔''

''سُکھی، میں سوچ رہا ہوں کہ اب میں گھر گرہستی چھوڑ کر ہردوار چلا جاؤں۔ کسی آشرم میں رہوں گا۔ زندگی کے باقی دن وہیں گنگا کنارے بسر کروں گا۔''

''آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ اگر میری بات مان لیں تو گرہست آشرم تیاگ کر دونوں چار دھام کی یاترا کرنے چلیں۔ میں کئی سالوں سے اس بارے میں سوچ رہی تھی مگر آپ کو کہنے سے ڈرتی تھی۔''

دوسرے روز ریل گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ کر دونوں ہردوار کی طرف روانہ ہوگئے۔ ریلوے اسٹیشن پر انہیں رخصت کرنے کے لیے کوئی بھی موجود نہ تھا۔نہ کسی نے پھولوں کی مالائیں گلے میں ڈالدیں اور نہ ہی کسی نے گلے لگا کر آنسوؤں سے الوداع کہا۔صرف ایک ریل گاڑی تھی جو راستے بھر انہیں لوریاں سناتی چلی جا رہی تھی۔

●□●

# ایک، دو اور تین

بچپن ہی سے سفید رنگ اس کے وجود کا احاطہ کر چکا تھا۔ اسی اسپتال میں رادھا کا جنم ہوا تھا جس میں اب وہ کام کرنے لگی تھی۔ سفید دیواروں، سفید لباسوں اور سفید چادروں کے بیچ۔

بچی کو جنم دیتے وقت رادھا کی ماں کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ زندگی کی آخری لڑائی لڑ رہی ہو۔ پاس پڑوس میں سہارا دینے والا اپنا پرایا کوئی بھی نہ تھا۔ شوہر نے عین وقت پر توتے کی طرح آنکھیں پھیر لی تھیں۔ دراصل رادھا شادی کے چار مہینے بعد ہی آ ٹپکی تھی جو باپ کو ناگوار گزرا تھا۔ باپ کی منشا تھی کہ جنم لینے سے پہلے ہی اس کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس نے بیوی کو بہت سمجھایا، رجھایا، منایا مگر بیوی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ پیار کی اس پہلی سوغات کو تلف کرنے کے حق میں بالکل نہ تھی۔ اس نے جی کڑا کر کے اپنا آخری فیصلہ سنایا" چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے، میں اپنے بچے کو جنم دے کر ہی رہوں گی"۔

بیوی کے اس فیصلے سے بغاوت کی بو آ رہی تھی۔ مردانہ وقار کو ٹھیس لگ گئی تھی۔ میاں بیوی دونوں ایک ہی اسپتال میں کام کرتے تھے۔ باپ اسٹور کیپر تھا اور ماں دائی کا کام کرتی تھی۔ دونوں کے عشق کے چرچے راہداریوں میں عام ہو چکے تھے۔ ابتداء میں شادی کرنے میں اڑچنیں آتی رہیں لیکن جب عشق نے گل کھلائے تو ذات پات کی فصیلیں خود بخود ٹوٹتی چلی گئیں۔ بہر کیف دنیا نے ان کو معاف نہ کیا۔ باپ جہاں بھی جاتا طنزیہ سرگوشیاں اس کا پیچھا کرتیں" پتنی نیچے وارڈ میں بچہ جنے اور پتی اوپر دوائیاں گنے۔ پیدا کرنے میں شرم نہ آئی، اب منہ دیکھنے میں شرم آ رہی ہے"۔ انجام کار اسے رہا نہ گیا۔ وہیں اسٹور ہی میں سائنائیڈ کھا کر دم توڑ دیا۔

"خودکشی کرنے کے لیے دل گردہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عین وقت پر ہمت جواب دیتی ہے۔ اپنی زندگی کی شمع کو اپنے ہاتھوں بجھانا کوئی آسان کام نہیں۔ ویسے آدمی تھا بڑا غیرت مند"۔ وہی لوگ جو اس کو طعنے تشنے دیا کرتے تھے اب اس کے مرنے کے بعد اس کی تعریفیں کرنے

لگے۔

اس کے برعکس رادھا کی ماں اس ہولناک طریقے سے اتفاق نہ کر سکی۔ وہ اس کارروائی کو بزدلی قرار دینے لگی۔ اس کا ماننا تھا کہ زندگی سے لڑنا مردانگی کی اصلی علامت ہے۔ اس سے بھاگنا تو بزدلی کی نشانی ہے۔ اس لیے وہ جیتی رہی...... اپنی خاطر اور اپنی اولاد کی خاطر۔

بچی کا نام 'رادھا' رکھا گیا...... رادھا یعنی ایثار و محبت کی نشانی۔ وہ اپنی ماں کی انگلی تھامے اسپتال کی چاردیواری میں پروان چڑھتی رہی۔ اپنی توتلی زبان سے اپنوں اور پرائیوں کا دل جیتتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کی روح میں فلورنس نائٹ اِنگیل کی روح سمانے لگی۔ ہائی سکول پاس کرتے ہی اس نے نرسنگ کورس کیا اور پھر اسی اسپتال میں نرس کا کام سنبھالا۔

متین چہرہ، خوش گلو اور خوش طینت۔ شکل وشمائل سے وہ فلورنس کا ہی دوسرا روپ لگ رہی تھی۔ مریضوں کے پہلو میں اس کا سورج اُگتا اور مریضوں کے پہلو ہی میں ڈوب جاتا۔ وہ تھی کہ تھکن کا نام بھی نہ لیتی تھی۔

کچھ لوگ نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ اس مادیت پرست دنیا میں بھی آئیڈلزم کی باتیں کرتے ہیں۔ دنیا کو سورگ بنانے کے خواب دیکھتے ہیں اور اپنی بے لوث اور بے ریا زندگی اس دنیا کو بہتر بنانے کے لیے وقف کرتے ہیں۔

رادھا کو اس بات کا وشواس تھا کہ اگر وہ ان سب مریضوں کی، جو اس کے اسپتال میں زندگی کی ساری امیدیں چھوڑ کر داخل ہوتے ہیں، خوشیاں لوٹا سکتی تو وہ اس کی زندگی کی معراج ہوگی۔

ایسے بھی کچھ لوگ ہوتے ہیں جو ان جیالوں کے قدرداں ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کی سچائیوں سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور پریشانیوں سے کبھی منہ نہیں موڑتے۔ میرا مطلب موہن سے ہے۔ ایک گونگا اور بہرا آرٹسٹ جو زندگی کے صوتی پہلو سے ہمیشہ محروم رہا ہے۔ وہ رادھا سے عشق کرتا ہے اور اس کا سایہ بن کر جینے کا تمنائی ہے۔ موہن اپنے جذبات کا اظہار صرف برش سے کینواس پر کرتا ہے۔ وہ رادھا کے ہر روپ کو کینواس پر اُتارتا ہے۔

ان کی پہلی ملاقات اسپتال میں ہی ہوئی تھی۔ موہن عارضی طور پر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ وہ سکینزوفرینیا میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسپتال میں بھرتی کرلیا اور نیند کے انجکشنوں

سے اس کو رام کر لیا مگر سچ تو یہ ہے کہ رادھا نے رات دن اس کی تیمارداری کی۔ اس نے رادھا کی تصویر اپنے من میں بسالی اور صحت یاب ہوتے ہی اُسے کینواس پر اتار لیا۔ ویسے تو اس اسپتال میں ایسے سر پھرے مریض آتے رہتے تھے۔ اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ رادھا ان سب کو اپنی یادداشت کا جزو بنالے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

قسمت نے بھی کروٹ لے لی۔ دیکھتے دیکھتے رادھا کی زندگی تلپٹ ہوگئی۔ موہن کو بھی اپنا کینواس بدلنا پڑا۔ اُن دنوں اسپتال میں ایک مریض آیا جو رادھا پر لٹو ہو گیا۔ اس کو جب اسپتال میں لایا گیا وہ شدید طور پر زخمی ہو چکا تھا۔ رادھا نے دل و جان سے پورے ایک مہینے اس کی سیوا کی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑ گئیں اور ساتھ ہی دونوں کے دل بھی۔ پہلے پہل جب وہ بستر سے اٹھنے کی کوشش کرتا تھا رادھا اس کو سہارا دیتی۔ بعد میں وہ بنا کسی سہارے کے چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔

مریض نے رادھا کو طرح طرح کے خواب دِکھائے اور اپنی چرب زبانی سے رادھا پر باور کرایا کہ زندگی دراصل بہت حسین ہے جبکہ اس نے اپنے آپ کو زندگی کی رنگینیوں سے محروم رکھا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق زندگی میں اجالے ہی اجالے ہیں جبکہ رادھا نے اندھیروں کو گلے لگا لیا ہے۔ ایسی صورت میں رادھا کے قدم ڈگمگانا ایک فطری عمل تھا۔ اس کی عمر کا تقاضا بھی کچھ ایسا تھا۔ وہ ان فریبی اجالوں کی تلاش میں چل پڑی۔

''رادھا میری تمنا ہے کہ تم اس اسپتال کے متعفن ماحول کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلو''۔ کنہیالال نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

کنہیالال سورت میں ساڑھیوں کا بیوپاری تھا۔ لاکھوں کی جائیداد تھی۔ اس کی نگاہوں میں انسانی زندگی کی وقعت کچھ بھی نہ تھی۔ اگر کسی چیز کی حقیقت تھی تو وہ تھا روپیہ۔ وہ محض اس مجبور بے سہارا لڑکی کی خدمت کا معاوضہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ رادھا کے لیے یہ انوکھا تجربہ تھا۔ اس کو پہلی بار کسی نے محبت سے یوں اپنانے کی پیشکش کی تھی۔ اسے یہ قطعی معلوم نہ تھا کہ محبت کا بھی مول تول ہوتا ہے۔ اس نے سنا تھا کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ محبت میں بھی آنکھیں کھول کر پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ کنہیالال کے تحائف کی چکا چوند نے اس کے دل کو پسیج لیا تھا۔ وہ زندگی کے ایسے دوراہے پر کھڑی تھی کہ ایک جانب اس کا منصب تھا اور

دوسری جانب زندگی کی آسائشیں۔ اس نے اپنے موجودہ حالات کا بغور جائزہ لیا۔ آگے پیچھے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ باپ نے خودکشی کر لی تھی اور ماں نے بھی راہ عدم اختیار کر لی تھی۔ رشتے داروں نے حرام کی اولاد سمجھ کر کبھی منہ نہ لگایا۔ اجنبی مریضوں سے دو چار روز پیار اور خوشیاں بانٹ لیتی، ان کی صحت یابی کے لیے رات دن پرارتھنا کرتی لیکن لوٹ کر کسی نے کبھی خیریت بھی نہ پوچھی۔ اس نے کنہیا لال کی پیشکش کو غنیمت جان کر اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اب کی بار گوتم کو رجھانے کے لیے مینکا نہیں آئی تھی بلکہ مینکا کو راہ سے بے راہ کرنے کے لیے خود گوتم آیا تھا۔

کہتے ہیں عشق میں آدمی اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنوں سے زیادہ غیروں پر بھروسہ کرتا ہے۔ رادھا نے کنہیا لال سے یہ بھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کہاں جا رہے ہو اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟

کنہیا لال نے سورت پہنچتے ہی ایک خوبصورت فلیٹ خریدا اور رادھا اس فلیٹ کی تزئین میں جٹ گئی۔ وہ ایک خوبصورت گھر کے خواب دیکھنے لگی جس میں وہ ہو، اس کا کنہیا ہو اور کلکاریاں کرتے ہوئے ان کے بچے ہوں جبکہ کنہیا لال نے رادھا کو ساری سکھ سویدھائیں میسر کر کے یہ سوچ لیا کہ اس کا سارا قرض اتر گیا اور وہ اب مکت ہو چکا ہے۔

سچائی کچھ ہی دنوں میں سامنے آئی۔ کنہیا لال اپنے آبائی مکان میں اپنے عیال کے ساتھ رہنے لگا اور رادھا اس کی داشتہ بن کر فلیٹ میں رات دن اس کا انتظار کرتی رہی۔ گو کنہیا لال نے زندگی کی تمام آسائشیں اسے مہیا کر دی تھیں پھر بھی وہ کنہیا لال کو اپنا نہ کہہ سکتی تھی۔ وہ نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ اس طرح خوابوں کے ٹوٹ جانے کے سبب اُسے اپنی سابقہ زندگی ترک کرنے کا بڑا افسوس ہوا۔ وہ اپنے آپ کو جی بھر کر کوسنے لگی۔ وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر وہ آسمان سے گر کر چاہ کنعاں میں قید ہو چکی تھی۔

کہاں تو وہ آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے آپ میں فلورنس نائٹ انگیل اور مدر ٹریسا کی شبیہ ڈھونڈا کرتی اور کہاں تو اب وہ اپنے آپ کو طوائف سے بھی بدتر سمجھنے لگی۔ اس کے چہرے پر کہیں بھی وہ پہلے جیسا عزم و استقلال نظر نہیں آ رہا تھا۔ کنہیا لال نے اس کے معصوم اور نازک جذبات کا فائدہ اٹھا کر اس کو کہیں کا نہ رکھا تھا۔ وہ عورت تھی اور عورت اپنے عاشق پر

بھروسہ کر کے اسکے ہاتھوں لٹنے میں لذت محسوس کرتی ہے۔

اب تو سب کچھ بدل چکا تھا۔صورت بھی اور سیرت بھی۔شوخ رنگوں کے ملبوسات، لپ اسٹک، غازہ اور دیگر بناو سنگھار، ہنسلی، پازیب، کنگن، چوڑیاں غرض بارہ ابھرن سولہ سنگھار اور ہر دن نئی نئی رنگ برنگی ساڑیاں۔

اسی پیراہن میں وہ آٹھوں پہر اپنے مالک کے انتظار میں بیٹھی رہتی مگر کنہیا لال عید کا چاند ہو چکا تھا۔

موہن رادھا کی تلاش میں یہاں بھی آ پہنچا۔اس کے کینواس پر شوخ رنگ اتنے پھیل گئے کہ ان میں نیک، رحم دل اور ایثار کی دیوی رادھا کی نشانی کہیں نہیں مل رہی تھی۔ ہزار کوششوں کے باوجود اس تصویر میں وہ رادھا کے احمریں ہونٹوں پر ہنسی نہیں لا سکا۔تصویر میں اس کے زخمی دل سے بہہ رہا خون جھلک رہا تھا۔موہن رادھا کا پجاری تھا۔سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتا تھا۔گو وہ رادھا کو ان بیڑیوں سے آزاد کروانے کا خواہاں تھا مگر اس کو اپنی کوتاہیوں کا بخوبی علم تھا۔ اس کی رہائی کے لیے نہ اس کے پاس دولت تھی نہ ثروت۔اس کو خود جینے کے لالے پڑے تھے پھر دوسروں کو کیا سہارا دے سکتا تھا۔وہ صرف بے بس تماشائی بن کر دیکھتا رہا۔

اس کے برعکس رادھا بے عمل نہ تھی۔وہ مسلسل اس تاک میں بیٹھی رہی کہ اس قید سے ہمیشہ کے لیے رہائی پا سکے۔ پڑوس میں ایک پندرہ سالہ لڑکا گوپال رہتا تھا جس کے ساتھ اس نے بازار سے سودا سلف لانے کے بہانے دوستی کر لی۔ وہ لڑکا بھی اس کے حسن سے سحر زدہ ہو گیا۔ جب بھی موقع ملتا رادھا کے پاس آ کر وہ گھنٹوں باتیں کیا کرتا۔اس طرح دونوں کا دل بہل جاتا۔البتہ وہ رادھا کو ہوس نہیں بلکہ مقدس پیار و محبت کا پیکر سمجھتا۔ وہ رادھا کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا اور اس بات کا اندازہ رادھا کو بھی ہو گیا تھا۔

گاؤں لوٹنے میں گوپال نے رادھا کی حد سے زیادہ مدد کی۔ریل گاڑی کا ٹکٹ خرید کر دیا۔اسٹیشن لے جا کر گاڑی میں بٹھا دیا۔راستے میں آنے والے اسٹیشنوں کی ایک ایک کر کے جانکاری دی تا کہ وہ صحیح مقام پر اتر جائے۔دو درجن کیلے اور پانی کی دو بوتلیں ساتھ دے دیں اور پھر نم آنکھوں سے الوداع کہہ دیا۔ریل گاڑی دھیرے دھیرے رفتار پکڑنے لگی اور چند ہی منٹوں میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ پلٹ کر بوجھل قدموں سے اسٹیشن سے باہر آ گیا۔تب اُسے

۱

احساس ہوا کہ وہ ریلوے اسٹیشن پر اپنا سب کچھ کھو چکا تھا۔اس کے باوجود اس کے دل میں فتحیابی کا احساس اسے شاباشی دے رہا تھا۔

رادھا مقررہ اسٹیشن پر اُتر گئی۔ وہ ادھر اُدھر دیکھتی رہی کہ مسافروں کی بھیڑ میں سے ایک آدمی اپنے کاندھے پر لمبا سا جھولا لٹکائے اور ہاتھ میں کینوس کا رول لیے نمودار ہوا۔وہ کن اکھیوں سے رادھا کو دیکھے جارہا تھا۔رادھا کو بھی اس کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگی۔اپنے خوف پر قابو پا کر رادھا نے ہمت کر کے اُسے آواز دی۔

''سنیے، کیا آپ مجھے نمیٹھا گاؤں کا راستہ بتا سکتے ہیں؟''

وہ آدمی رادھا کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا اور کوئی ردعمل ظاہر نہ کر سکا۔رادھا نے پھر اس کو پکارا اور اس کی طرف ملتجی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

''سنیے، مجھے نمیٹھا گاؤں جانا ہے۔آپ راستہ بتا دیں گے؟''

اب کی بار وہ آنکھوں کی زبان پڑھ چکا تھا۔اس نے اشاروں میں بتایا کہ وہ نہ سن سکتا ہے اور نہ ہی بول سکتا ہے۔تاہم رادھا اس کے ہاتھ کے اشاروں سے اندازہ لگا سکی کہ وہ بھی اسی کے گاؤں کی جانب جارہا ہے۔دونوں اسٹیشن سے باہر نکلے،بس میں چڑھے اور آدھ پون گھنٹے میں اپنے گاؤں پہنچ گئے۔پورے سفر کے دوران رادھا یہی سوچتی رہی کہ اس آدمی کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔بہت کوشش کے باوجود اس کو کچھ بھی یاد نہ آرہا تھا۔

اس آدمی کے رخصت ہونے کے تُرنت بعد رادھا کے ذہن پر مانو ایک کوندا سا لپکا اور اسے یاد آیا کہ یہ وہی آدمی ہے جو برسوں پہلے بدحواسی کی حالت میں اسپتال میں بھرتی ہوا تھا۔سکیزوفرینیا کی وجہ سے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔وہ بچپن ہی میں تیز بخار کی وجہ سے اپنی قوت سامع اور قوت گویائی کھو چکا تھا۔رادھا کو یہ بھی یاد آیا کہ وہ ایک اچھا آرٹسٹ ہے اور اس نے رادھا کی تصویر بنانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔دفعتاً رادھا نے اس کو بلانے کی کوشش کی مگر وہ بہت دور نکل چکا تھا۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ آدمی کا خمیر آخر کار رنگ لاتا ہے۔رادھا کی پرورش اور اس کا جوہر اس کو واپس اسی ڈگر پر لے آیا جہاں سے اس کے قدم ڈگمگائے تھے۔فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار رادھا نے ایک این جی او کے ساتھ ناتا جوڑا اور اپنی رہی سہی زندگی سماجی کاموں کے لیے وقف

کرنے کی ٹھان لی۔ گاؤں میں عورتوں کو ان کے حقوق سے باخبر کرنا، تعلیم بالغان کے تحت بالغ لڑکیوں اور عورتوں کی پڑھائی کا معقول انتظام کروانا اور گاؤں میں فیملی ویلفیئر سنٹر قائم کروانا اس کی زندگی کا مقصد بن گیا۔ اس کام کو رادھا نے بہ طریق احسن انجام دیا۔ اپنے رنگین پیراہن کو اتار پھینک کر اس نے دوبارہ سفید کھدر کا لباس زیب تن کیا اور اس پر فخر کرنے لگی۔ حلیمی اور انکساری اس کی شخصیت کے جزولاینفک بن گئے۔ لوگوں کی سیوا کرنا اس کا پرم دھرم بن گیا۔

چند مہینے پہلے کی ہی بات ہے کہ گاؤں کے پنچوں نے فیصلہ کرلیا کہ رادھا دیوی کو الیکشن میں کھڑا کیا جائے۔ دراصل فیصلہ تو ایک فارملٹی تھی ورنہ سارے گاؤں نے اس کو اسی دن اپنا نیتا چن لیا تھا۔

رادھا دیوی بھاری اکثریت سے الیکشن میں کامیاب ہو کر ایم ایل اے بن گئی۔ اتنا ہی نہیں اس کی مقبولیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو کابینہ میں بطور وزیر برائے سماجی بہبود شامل کرلیا گیا حالانکہ وہ پہلی مرتبہ قانون سازیہ کی کارکن بن چکی تھی۔

موہن بھی ایک نئے کینوس پر رنگ بھرنے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے رادھا دیوی سے اپوائنٹمنٹ لیکر اس کی تصویر بنالی۔ اسٹوڈیو واپس لوٹنے کے بعد موہن نے تینوں تصویروں کی نوک پلک درست کرلی اور آنے والی نمائش کے لیے انہیں تیار کرنے لگا۔

وہ ان تصویروں کو عنوان دینا چاہتا تھا مگر کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ وفورِ جذبات آدمی کو کبھی پتھر بنا دیتے ہیں۔ دفعتاً اُسے خیال آیا کہ یہ تو ایک ہی زندگی کے مختلف پہلو ہیں پھر ان کے لیے مختلف عنوان کیوں؟

اس نے اپنا برش اٹھایا، گیلے رنگ میں ڈبو دیا اور پھر تصویروں پر صرف نمبر لگا دیے۔ ایک......دو......اور......تین!

●□●

# سرحدیں

یتۂ کھو، یتہِ کیاہ، یتہِ چھیہِ دیوتا

تتہِ چھیہِ شارِکا، ہلمت تہِ رُدرا

ہماری گلی میں جب بھی کتے واویلا مچاتے تو میرے پتا جی کشمیری زبان میں ان الفاظ کا ورد کرنا شروع کر دیتے۔ بھگوان جانے یہ منتر تھا یا جھاڑ پھونک کا کوئی نسخہ لیکن ان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ کتوں کا واویلا کرنا اشُبھ ہوتا ہے اور اس کا توڑ صرف اس منتر میں مضمر ہے۔ بہر حال کتے تھے کہ ہمارے ہی گھر کے عقب میں ہمیشہ بھونکتے اور اکثر جھڑپتے رہتے۔

ہمارا گھر دو گلیوں کے ٹی جنکشن پر واقع تھا۔ پیچھے ایک گلی تھی جو سیدھی جا کر سڑک سے جا ملتی جبکہ سائیڈ والی گلی انگور کی بیل کی مانند دیگر محلوں سے گزرتی چلی جاتی اور نہ جانے کہاں اپنا وجود کھو بیٹھتی۔ یہی ٹی جنکشن گلی کے کتوں کا دارالحرب بن چکا تھا۔

پچھلی گلی پر کتوں کے ایک مخصوص گروہ کا قبضہ تھا۔ تین ہٹے کٹے نر تھے اور دو مادہ۔ یہ کتے با خوف وخطر اپنی گلی میں گھومتے پھرتے اور ہمیشہ کھانے پینے کی چیزوں کی تلاش میں رہتے۔ جب بھی کہیں کسی کھڑکی یا دروازے سے کسی شخص کی مانوس 'کوُچ کوُچ' یا 'نچونہہ، نچونہہ' کی آواز سنائی دیتی، سب کے سب بجلی کی رفتار سے دوڑ پڑتے اور اپنا حصہ لینے کے لیے چھینا جھپٹی میں مصروف ہو جاتے۔ عموماً بلانے والا شخص کوئی عورت ہوتی جو باسی چاول، بچی کھچی ہڈیاں یا سوکھی سڑی روٹیاں ان کے سامنے ڈال دیتی اور وہ اپنا حصہ لینے کے لیے اپنی دم ہلاتے رہتے۔ کم پڑتا یا پھر اور ملنے کی امید ہوتی تو دیدے پھاڑ پھاڑ کر وہیں پر سائل بنے رہتے۔

یہ کتے جان کی بازی لگا کر اپنے علاقے کی حفاظت کرتے۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ آنکھ اٹھا کر بھی ان کے علاقے کی طرف دیکھ لیتا۔

یہی حال سائیڈ والی گلی کا بھی تھا۔ اس گلی پر ایک خاص مقام تک دوسرے گروہ کا راج

تھا۔ دو نر تھے اور دو مادہ۔ یہ کتے بھی اپنے علاقے کے محافظ تھے۔ ان کی سرگرمیاں اپنے علاقے تک محدود رہتیں۔ ہر گھس پیٹھیے پر ان کی کڑی نگاہ رہتی اور معمولی سی مداخلت بھی ان سے برداشت نہ ہوتی۔

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ ایک گروہ کے کتے اپنی گلی چھوڑ کر دوسری گلی میں ہرگز نہ گھستے اور نہ ہی کبھی علاقۂ غیر کو حرص وطمع کی نظروں سے دیکھتے۔ بس جہاں دوسرے گروہ کے پیشاب کی بو سونگھ لیتے، وہیں ان کی سلطنت ختم ہو جاتی اور وہ اس سرحد سے مڑ کر واپس چلے آتے۔ وہ دوسرے کتوں کے علاقے کا احترام کرتے۔

کتے اپنے علاقے کی حد بندی بارود بچھا کر نہیں بلکہ اپنے پیشاب سے کر لیتے ہیں۔ انہیں اپنے ایریا میں جب بھی کوئی اجنبی شئے ملتی یا کسی جگہ پر وہ مخصوص بو نہیں ملتی جو ان سے وابستہ تھی تو وہ اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر فوراً اس پر مُوت دیتے تا کہ سند رہے۔ کتوں کی یہ خصلت انوکھی ہے جو آج کل کے تہذیب یافتہ انسانی معاشرے میں نہیں پائی جاتی۔ خود ضابطگی کی ایسی مثال اشرف المخلوقات کی بجائے ان جانوروں ہی میں ملتی ہے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ کتوں کے دو گروہ آپس میں کبھی نہیں لڑتے ہوں۔ بلکہ صورت حال اس کے بالکل الٹ تھی۔ ہر شام سرحد کی دونوں جانب محاذ آرائی ہوتی۔ دونوں گروہوں کے کتے۔ نر مادہ، چھوٹے بڑے، سبھی ایک دوسرے کی شہ پا کر بھاگے چلے آتے۔ جانے انجانے ایک دوسرے کو للکارتے، غرّاتے اور پھر جنگ کا اعلان کر دیتے۔

''اُو......و......و، اُو......و، عَف عَف'' پہلا گروہ ہم آواز ہو کر بھونکتا۔

''اُو......او......اُو......و، عَف، عَف'' دوسرا گروہ تُرنت مکافاتی کارروائی کرتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شور وغل اتنا بڑھ جاتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ آس پاس کے مکانوں میں رہنے والے لوگ اس مسلسل چیخم دھاڑ سے تنگ آ جاتے اور بعض اوقات ان کتوں کو منتشر کرنے کے لیے ان پر ڈنڈے یا پتھر برساتے۔ کبھی کبھی ان لڑائیوں کے دوران پلّوں کے بلبلانے کی دلسوز آوازیں آتیں اور سننے والوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ چند لحظوں کے بعد ان پلّوں کی روح پرواز کر جائے گی۔ بہرحال گذشتہ پچاس برسوں میں نہ تو میں نے ان لڑائیوں میں کسی کو بری طرح زخمی ہوتے دیکھا اور نہ ہی کسی کی موت واقع ہوتی دیکھی۔ حالانکہ ہر شام جنگ کے

بگل بجتے، دونوں طرف سے بھونکنے کی آوازیں آتیں اور اکثر و بیشتر گھمسان جھڑپیں چھڑ جاتیں۔ کبھی کبھار چند ایک کتے نصف شب تک آسمان کی جانب سر اٹھا کر بین کیا کرتے۔

کتوں کی ایک اور خصوصیت جو انسانوں سے مختلف ہوتی ہے، افزائش نسل کا طریقہ ہے۔ کتیا جب تک حدت کی حالت میں نہ ہو، وہ مجامعت کے لیے تیار نہیں ہوتی اور یہ حالت سال میں ایک دو بار ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ صرف ایسی حالت میں کتیا کا حمل ٹھہرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس لیے گروہ کے کتے ان دنوں کتیا کو رِجھانے کے لیے طرح طرح کے داؤ پیچ آزماتے ہیں۔

کتوں کی صحبت باہمی ہم بچوں کو نرالی لگتی۔ وہ انسانوں کی مانند ہر پل ہر وقت شریک صحبت کی تلاش میں نہیں رہتے۔ عام طور پر یہ کارروائی شب میں ہوا کرتی لیکن بعض اوقات دن میں بھی دیکھنے کو ملتی۔ جب بھی کوئی کتیا جوش میں آتی، اس کے گروہ کے کتے اسے زیر کرنے کے لیے اپنی دم بار بار ہلاتے، اسے چومتے چاٹتے اور آخر کار ان میں جو طاقت ور ہوتا وہ کامیاب ہو جاتا۔ ایسی باتیں تو خیر سبھی جانوروں میں نظر آتی ہیں مگر کتوں میں جو خاص بات قابل توجہ ہے وہ نر اور مادہ کا بہت دیر تک آپس میں جڑے رہنا ہے۔ اس حالت میں شریر بچے تجسس کے باعث ان کا تعاقب کرتے یا کبھی کبھار ان پر پتھر پھینک کر الگ کرنے کی کوشش کرتے۔ عورتیں تو خیر نظریں چرا کر نکل جاتیں البتہ بوڑھے بزرگ پاس کھڑے بچوں کو تنبیہہ کرتے کیونکہ انہیں اس بات کا احساس ہوتا کہ بچے خواہ مخواہ اس فطری عمل میں دخل اندازی کر رہے ہیں۔

ایک رات غضب ہوا۔ سائیڈ والی گلی کی کتیا حدت کی حالت میں پریشان تھی۔ گلی کے کتے روزمرہ کی معرکہ آرائی کے بعد سو چکے تھے۔ چودھویں کا چاند اپنی نقرئی کرنوں سے زمین کی ہر شئے کو نہار رہا تھا۔ دفعتاً کتیا کی نظر سرحد کے اس پار دوسری گلی پر پڑی جہاں ایک خوبصورت کتا کب سے اپنی دم ہلا ہلا کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گو سرحدیں مانع تھیں مگر دونوں ایک دوسرے کی جانب کھنچے چلے جا رہے تھے۔ عشق عقل پر حاوی ہو گیا اور ڈری سہمی کتیا دم دبائے ہوئے چپ چاپ آہستہ آہستہ دوسری گلی میں داخل ہو گئی۔ کتا جو بہت دیر سے اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا تھا اپنی دم ہلاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ کتیا اپنے محبوب کی موجودگی میں سارے عالم سے بے خبر ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور انجام کار یک جان دو قالب ہو گئے۔

اسی اثنا میں پچھلی گلی کی ایک کتیا کی آنکھ کھُل گئی۔ اپنے علاقے میں اس اجنبی کتیا کو دیکھ کر وہ حسد اور جلن کی آگ سے تپ گئی اور زور زور سے بھونکنے لگی۔ اس کی آواز سنتے ہی گلی کے سبھی کتے اکٹھا ہو گئے اور ان دو جڑی ہوئی روحوں پر بھونکنے لگے۔ انہوں نے بار ہا اس جوڑے پر حملہ کیا اور انہیں جدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ان کی آوازیں سن کر سائیڈ والی گلی کے کتے بھی جمع ہو گئے اور ان کو للکارنے لگے۔ دفعتاً دونوں گروہ محاذ پر آمنے سامنے ڈٹ گئے اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے۔ پچھلی گلی والے کتے یہ بھول ہی گئے کہ ان کے علاقے میں کوئی کتیا گھس پیٹھ کر کے اندر آ چکی ہے اور ان کے ایک بانکے کتے کو ورغلانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔

سرحدیں خاموش اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ اختتام پر کتیا کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ علاقۂ غیر میں سکونت اختیار کرے یا پھر واپس چلی جائے۔ جس علاقے میں وہ آئی تھی وہاں کے کتوں کے لیے وہ ناقابل قبول تھی۔ اس لیے اس نے واپس اپنے علاقے میں جانے کی ٹھان لی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ اپنے عشق کی نشانی بھی ساتھ میں لیے جا رہی تھی۔

وہ اپنی دم دبائے چپکے سے لڑتے جھگڑتے کتوں کے بیچ میں سے راستہ بنا کر اپنے علاقے میں داخل ہوئی۔ اس کی دبی ہوئی دم نے جنگ کے میدان میں سفید پرچم کا کام کیا۔ اسے خود لڑائی جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ حالانکہ اس کے علاقے کے سبھی کتے اس وقت دوسری گلی کے کتوں سے برسرِ پیکار تھے۔

اس مراجعت پر اس کے گروہ کے کسی کتے نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ جیسے کہیں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اگر آدم زاد ہوتی تو نہ جانے کیسے کیسے سوال اٹھائے جاتے، رنگ و مذہب، نسل و ذات کا حوالہ دیا گیا ہوتا اور کون جانے کیسے کیسے عتاب اس پر نازل کیے جاتے۔ اتنا بھی ممکن تھا کہ دار و رسن اُس کے خون سے اب تک تر ہو چکے ہوتے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ گذشتہ ایام کی طرح ہی روزمرہ کے کاموں میں جُٹ گئی۔

پھر چند مہینوں کے بعد اسے اپنا جسم بھاری سا محسوس ہونے لگا۔ اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر آیا۔ اس نے گلی کے شور شرابے سے دور ایک مکان کے تھڑے کے نیچے اپنا مسکن

بنالیااور یہیں پر چھ پیارے پیارے خوبصورت پلّوں کورات کے اندھیرے میں جنم دیا۔ مکان کی مالکن ہر روز کتیا کے سامنے مٹی کے برتن میں تازہ پیچ رکھ دیتی جسے وہ ثواب کا کام سمجھتی تھی۔ کئی ہمسائے بھی بچا کھچا کھانا تھڑے کے نیچے رکھ کر چلے جاتے۔ کتیا جہاں بھی جاتی، ننھے منے پلّے اس کے ساتھ چلے جاتے۔ جس جگہ بھی کھڑی ہوتی وہ اچھل اچھل کر ماں کے بھاری بھر کم پستانوں کو منہ میں پکڑنے اور چھوڑنے کی کوشش کرتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پلّے بڑے ہو گئے۔ ان میں سے چار تو لقمۂ اجل ہو گئے جبکہ باقی ماندہ دو اپنے گروہ میں شامل ہو کر ہر شام اپنے علاقے کی حفاظت کے لیے محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کرتے۔ انہوں نے بھی اپنی سرحدوں کی نشاندہی کے لیے جگہ جگہ پیشاب کر لیا۔ وہ ہر روز اس بات کا اطمینان کر لیتے کہ کوئی اجنبی کتا ان کے ایریا میں تو نہیں گھسا ہے۔

انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ جن کتوں کے ساتھ لڑ رہے ہیں ان میں سے ایک ان کا اصلی باپ ہے۔ انہوں نے اپنی سرحدیں رشتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ جغرافیائی اساس پر طے کر لی تھیں۔ انہوں نے اپنے علاقے کے حدود پر مُوت کر اپنے خونی رشتوں سے قطع تعلق کر لیا تھا اور اب اپنی گلی میں آوارہ اور بے فکر گھوم رہے تھے۔

●□●

# دو گز زمین

آل انڈیا ویمنز ٹیبل ٹینس کا مقابلہ شیلانگ میں ہونے والا تھا۔محکمہ ڈاک کے اسپورٹس افسر نے مجھے افتتاحی پروگرام کا دعوت نامہ بھیج دیا۔ان دنوں میں آرمی پوسٹل سروس میں میجر تھا۔

پہلے دن میگھالیہ اور اڑیسہ کے درمیان مقابلہ ہوا۔میگھالیہ کی طرف سے کھیل رہی عورت جب بھی کوئی پوائنٹ جیت لیتی ، میں تالیاں پیٹ کر اس کی حوصلہ افزائی کرتا۔وہ مڑ مڑ کر مجھے دیکھتی اور مسکرادیتی۔

پانچ روز کے بعد فائنل دیکھنے کے لیے ایک اور دعوت نامہ موصول ہوا۔کارڈ کے نیچے لکھا تھا۔''گیس ہو......؟''

میں تردّد میں پڑ گیا کہ کون ہوسکتا ہے۔ٹیلی فون کر کے اسپورٹس افسر سے پوچھ لیا مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔بہت سوچ بچار کرنے پر جب کچھ سمجھ نہیں آیا، میں نے اس موضوع پر سوچنا ہی بند کر دیا مگر دل تھا کہ مانتا ہی نہ تھا۔''آخر کون ہوسکتا ہے؟''

گھنٹے بھر کے بعد میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔میں نے رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے کوئی نسوانی آواز سنائی دی۔

''میں نے دعوت نامہ بھیجا تھا۔امید ہے آپ کو مل گیا ہوگا۔''

''جی ہاں مل چکا ہے۔لیکن آپ......؟''میں ابھی سوال کر ہی رہا تھا کہ اس نے میری بات کاٹ لی۔

''میں......! کیوں آپ اندازہ نہیں لگا سکتے ؟''

''نہیں، مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔آپ کل آیئے گا۔خود ہی معلوم پڑے گا۔''

وہ رات میں نے کیسے گزاری، خدا ہی جانتا ہے۔تجسس کا یہ عالم تھا کہ نصف شب ہی میں

اگر سورج اُگ آتا میں میچ دیکھنے کے لیے فوراً چلا جاتا۔ بہر حال دوسرے روز معینہ وقت پر میں انڈور اسٹیڈیم پہنچ گیا۔ ابھی ہال میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہ عورت، جو میگھالیہ کی طرف سے چند روز پہلے کھیل رہی تھی میرے سامنے آئی، مسکرائی اور پھر مجھے صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

''اوہ، تو آپ تھیں۔ آپ کو میرا ایڈریس کیسے معلوم ہوا؟''

''میجر اکھلیش، جہاں چاہ ہوتی ہے وہاں راہ مل ہی جاتی ہے۔ پچھلے دنوں میں نے دو تین میچ اور بھی کھیلے مگر آپ آئے نہیں۔ آپ کو بہت مِس کیا۔''

''اوہ تھینکس، معلوم ہوتا تو ضرور آجاتا۔ بہر حال فائنل تک پہنچنے کے لیے مبارکباد۔ بھگوان کرے آپ فائنل بھی جیت جائیں۔''

''آپ کی آشیرباد ہو تو ضرور جیت لوں گی۔''

''آپ نے اپنا پورا نام نہیں بتایا۔''

''میرا نام ہے تارا دیوی گرُنگ۔ آپ مجھے صرف تارا کہہ سکتے ہیں۔''

''بڑا پیارا نام ہے۔ آپ نیپالی لگتی ہیں۔''

''ہوں تو نیپالی مگر شیلانگ میں ہی جنمی ہوں۔ دادا جی انگریزوں کے زمانے میں یہاں چلے آئے تھے۔ پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔''

اس ملاقات کے بعد تارا سے شناسائی کافی حد تک بڑھ گئی۔ چونکہ ان دنوں میری فیملی اسٹیشن میں نہیں تھی اس لیے وہ اکثر میرے گھر آیا کرتی اور میرے لیے لذیذ کھانے تیار کر کے رکھتی۔ اکثر و بیشتر وہ آتے وقت خود ہی بازار سے مرغا یا مچھلی خرید کر لاتی اور اس میں طرح طرح کے مصالحے ڈال کر ذائقہ دار بنا لیتی۔ میرے دفتر کا ٹائم آٹھ سے دو بجے تک تھا۔ ڈھائی بجے لنچ کر لیتا اور پھر چھٹی۔ ہاں شام کو کبھی کبھار بیڈمنٹن کھیلنے جایا کرتا اور وہ بھی جس دن تارا گھر میں نہیں ہوتی۔

تارا شادی شدہ عورت تھی۔ اس کا شوہر ٹرانسپورٹ کا بزنس کرتا تھا۔ دو بچے تھے جو اسکول میں پڑھتے تھے۔ سارا خاندان کرسچن تھا۔ اس کے دادا جی ہندو سے عیسائی بن گئے تھے۔ تارا نے تعلیم بھی سینٹ میری کانونٹ ہی میں حاصل کی تھی۔ گریجویشن کے بعد اکاؤنٹنٹ جنرل کے آفس میں کلرک بن چکی تھی۔ پتا جی نے شادی بھی نو مذہب عیسائی ہی سے کر دی تھی۔

اسکول میں اسے راہباؤں کے ساتھ قلبی قربت رہی۔ان کے طور طریقوں سے کافی متاثر ہوئی۔وہ خود بھی راہبہ بننا چاہتی تھی لیکن گھر والوں نے جلدی شادی کر کے اس کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔بہر حال راہباؤں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا اثر اس کی زندگی پر واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔نصرانی راہبائیں اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے حاجز رکھنے کے لیے آزمودہ نسخے استعمال میں لاتی ہیں۔وہ ہر قسم کی جوشیلی یا شہوت انگیز کارروائی سے پرہیز کرتی ہیں۔اپنے اعضائے مخصوصہ کی دُہنیت سے انہیں بہت ڈر لگتا ہے۔اس لیے اپنے بدن کو ہمیشہ صاف ستھرا اور خشک رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔کبھی بھی،کہیں بھی ذرا سی نمی کا احساس ہوا تو فوراً انجذابی کارروائی کرتی ہیں۔راہباؤں کی دیکھا دیکھی میں تارا نے بھی اس عادت کو اپنا لیا۔وہ اور اس کی تولیا لازم و ملزوم بن چکے تھے۔وہ کسی قسم کی جسمانی رطوبت کو پسند نہیں کرتی تھی نہ ہی کبھی خود کو گیلا ہونے دیتی تھی۔لیکن وہ یہ بھول رہی تھی کہ وہ شادی شدہ عورت ہے کوئی راہبہ نہیں۔تعجب تو اس بات کا تھا کہ دو بچے پیدا ہونے کے باوجود اس نے پوری ازدواجی زندگی میں کبھی لمحۂ مستی کا تجربہ نہیں کیا تھا۔اس کے دماغ میں ہر وقت یہی ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں کسی جانب گیلا پن پیدا نہ ہو۔یہی وجہ تھی کہ اس کو ذہنی صحبت سے بھی شدید نفرت تھی۔

تارا اور میرے درمیان جب فاصلے مٹ گئے تو مجھے اس کی ادھوری زندگی پر ترس آنے لگا۔وہ زندگی کی اہم ترین مسرت سے محروم تھی۔دھیرے دھیرے میں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ گیلا پن باہمی میل جول کے لیے ناگزیر ہے اور اس کے بغیر وہ اپنے آپ کو زندگی کی اہم ترین نعمت سے محروم کر رہی ہے۔بچہ ہونا اور محظوظ ہونا دو الگ الگ باتیں ہیں۔دنیا میں ایسے بھی کئی جوڑے ہیں جو دس بارہ بچوں کے باوجود لمحۂ مستی کے لیے ترستے ہیں۔آخر کار بات اس کی سمجھ میں آ ہی گئی اور اس نے اپنی تولیا کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔اس طرح وہ زندگی کی سرمستیوں سے ہمکنار ہو گئی۔

اس واقعے کے بعد جب تارا مجھ سے ملی تو اس سے رہا نہ گیا۔کہنے لگی۔"میجر اکھلیش، تم کو معلوم ہے میرے پتی نے چند روز پہلے مجھ سے کیا کہا۔"

"کیا کہا......؟"میں نے پوچھا۔

"اس نے کہا، تم اب بستر میں بالکل مختلف لگتی ہو۔"

میں نے بس مسکراہٹ سے اس کا جواب دیا۔ بہر حال ہمارا ساتھ جلدی ہی چھوٹ گیا کیونکہ مجھے شیلانگ چھوڑ کر جانا پڑا۔ البتہ آٹھ نو سال کے بعد میرا تبادلہ گوہاٹی ہوا جو شیلانگ سے صرف ایک سو پانچ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ پتہ چلا کہ تارا اب گوہاٹی میں ہی رہتی ہے۔ ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا اور اس نے مجھے اسی روز شام کو اپنے گھر بلایا۔ وہ دیکھتے ہی مجھ سے بغل گیر ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلک رہے تھے۔

''تم تو شیلانگ میں رہتی تھی پھر یہ گوہاٹی میں مکان خریدنے کی کون سی تک ہے؟ موسم کے لحاظ سے تو شیلانگ بہتر جگہ ہے۔'' میں اپنے استعجاب کو چھپا نہ سکا۔

''میجر اکھلیش، یہ بہت ہی دردناک کہانی ہے۔ میں اپنی مرضی سے نہیں آئی بلکہ مجھے وہاں سے نکالا گیا۔''

''وہ کیسے؟''

''جب میرے پتا جی مر گئے ہم ان کی لاش کو اسی قبرستان میں سپرد خاک کرنے کے لیے لے گئے جہاں میرے دادا اور دادی دفن ہیں۔ وہ قبرستان اس چرچ کے متصل ہے جہاں میں اور میرے بچے ہمیشہ عبادت کرنے کے لیے جاتے تھے۔ اس گورستان کے بغل میں وہ اسکول بھی ہے جہاں میں نے تعلیم کی بارہ منزلیں طے کر لی تھیں۔ اسی اسکول کی راہباؤں نے مجھے عیسائی دھرم کی خوبیوں سے آگاہ کیا تھا۔ میں اس قبرستان میں اپنے پتا جی کے لیے دو گز زمین کی بھیک مانگنے گئی تھی۔''

انہیں راہباؤں نے تمہیں اپنے اعضا خشک رکھنے کی ہدایت بھی دی تھی!'' میں نے تناؤ کم کرنے کی غرض سے دل لگی کے انداز میں پوچھا۔

وہ ہنس پڑی البتہ اپنا کلام جاری رکھا۔ ''یونو اس کے بعد کیا ہوا؟ وہاں سبھی کھاسی جمع ہو گئے اور انہوں نے مزاحمت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ گورستان کھاسی عیسائیوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں نیپالی نو نصرانیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''عیسائیوں میں تو بھید بھاؤ نہیں ہوتا۔ پھر ایسا کیوں؟''

''نفرتیں پیدا ہونے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی مذہب نہیں ہے جس میں فرقے نہ ہوں، تضادات نہ ہوں اور پھر آدمی خود غرضی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا۔ بس بہانہ

ڈھونڈنے کی دیر ہوتی ہے۔ گذشتہ دس پندرہ سالوں سے شیلانگ میں کھاسیوں اور نیپالیوں کے درمیان آپس میں تناتنی ہے۔ کئی بار دنگے بھی ہو چکے ہیں۔ کھاسیوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے بندوق کا سہارا لیا ہے۔ اب تک دہشت گردی کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔ بہت سارے معصوم گورکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔"

"فرقہ وارانہ فسادات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی لڑائی نئے مہاجر گورکھوں سے ہے نہ کہ آپ لوگوں سے جو کئی پیڑھیوں سے وہاں رہتے چلے آئے ہیں۔ آپ لوگ بھی برسوں سے شیلانگ میں رہتے ہیں۔ اور پھر مُردوں سے کیا بیر...... مُردوں کی تو کوئی ذات نہیں ہوتی!"

میجر اکھلیش، گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جاتا ہے۔ وہ سبھی نیپالیوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ کیا معلوم کس دن ہماری باری آجاتی۔"

"پھر تم لوگوں نے کیا کیا؟"

"ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ ہمارے ایک دوست نے گوہاٹی میں پتا جی کے کفن دفن کا انتظام کرایا۔ پھر ہم نے لاش کو ٹرک میں لاد کر گوہاٹی پہنچا دیا اور یہیں پر دفنا دیا۔ اس کے بعد ہم نے شیلانگ کی جائیداد کوڑیوں کے مول بیچ کر یہاں گوہاٹی میں یہ چھوٹا سا مکان بنا لیا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔"

"تارا مجھے اس بات کی حیرت ہے کہ عیسائیوں میں فرقے ہوتے ہیں نہ ذات پات کا جھگڑا، پھر بھی یہ سب کچھ ہوا۔"

"آپ کو کس نے کہا ہے کہ عیسائیوں کے فرقے نہیں ہوتے۔ گورے اور کالے عیسائی کیا برابر کا حق رکھتے ہیں۔ یہ تو محض کتابی باتیں ہیں۔ زمینی حقیقت وہ ہے جو میں نے ابھی آپ کو بتائی۔"

یہ باتیں سن کر مجھے یقین ہوا کہ تارا اس تلخ تجربے کی وجہ سے عیسائی مذہب سے بدظن ہو چکی ہوگی اور شاید اپنا مذہب پھر سے تبدیل کیا ہوگا۔ لیکن دفعتاً میری نظر کارنس پر رکھی ہوئی انجیل مقدس اور کینڈل اسٹینڈ پر پڑی۔ ان کے ٹھیک اوپر صلیب پر لٹکی ہوئی یسوع مسیح کی تصویر تھی جس کے سر پر کانٹوں کا تاج تھا اور ہاتھ پاؤں خون سے لت پت تھے۔

تصویر کے نیچے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "دنیا کے غریبو اور مظلومو، آؤ، میری شرن میں

آؤ۔ یہاں پر تمہیں خدا ملے گا۔"

میرے من میں خیال آیا۔ "ایک وہ ہے جس کا دل اتنا وسیع ہے کہ ساری کائنات کو اپنے اندر سمونا چاہتا ہے اور ایک یہ ہیں اس کے مرید، جو عیسائی کو بھی گز بھر زمین نہیں دیتے۔"

●□●

# گھر کا بیدی

ڈاکیے نے منی آرڈر کی رسید اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ یہ وہی منی آرڈر تھا جو امر ناتھ نے دس روز پہلے اپنی بیوی منگلا کو گاؤں کے ایڈریس پر بھیجا تھا۔ پورے پانچ ہزار روپے تھے۔ اب تو یہ امر ناتھ کا معمول بن چکا تھا۔ ادھر تنخواہ ملی نہیں ادھر اپنا جیب خرچ الگ رکھ کر باقی ماندہ رقم منگلا کو بھیج دی۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کا کرایہ بلاناغہ ہر مہینے بھیج دیتا تھا۔ اُسے وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔

منگلا اپنے میکے میں نہیں رہتی تھی۔ البتہ امر ناتھ کے والدین کے ساتھ اپنی سسرال میں رہتی تھی۔ شادی کے بعد وہ خال خال ہی اپنے شوہر کے پاس رہی۔ بوڑھے سسر اور ساس کی خدمت کا بہانہ بنا کر وہ دس پندرہ روز ہی میں لوٹ جاتی۔ اسے شہری زندگی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اب تک تین بچوں کی ماں بھی بن چکی تھی۔ پھر گاؤں میں اتنی ساری کھیتی کی دیکھ بھال بھی تو کرنی تھی۔

منی آرڈر کی رسید جیب میں رکھ کر امر ناتھ فکر و تردّد کے سمندر میں ڈوب گیا۔ پچھلی بار جب منگلا اس کو چھوڑ کر گاؤں واپس چلی گئی تھی کالونی میں بہت بڑا ہنگامہ ہوا۔ چونکہ امر ناتھ میرے آفس میں اسٹینوگرافر تھا اس لیے میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور اس کی مدد کرنے کی کوشش کی۔

''تم نے اپنی بیوی کو جانے کیوں دیا؟'' میں نے امر ناتھ سے سوال کیا۔

''سر، کرتا بھی کیا۔ اس نے تو پہلے ہی سے اپنے کپڑے لتے تیار رکھے تھے۔ جونہی میں نے دفتر جانے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھا وہ بچوں کو لے کر میرے پیچھے پیچھے چل پڑی''

''تم نے روکا کیوں نہیں؟''

''کیسے روکتا ساب! روکنے سے وہ کون سار کنے والی تھی۔ اس نے دو روز پہلے ہی سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ سر، پوری کالونی میں میری بدنامی ہو چکی ہے۔ اب اور سہا نہیں جاتا''۔

''اس سے پہلے بھی کبھی بھاگی تھی؟''

''کئی مرتبہ۔ ہمیشہ یونہی دس پندرہ روز رہ کر چلی جاتی ہے''۔

''جاتی کیوں ہے؟ تم نے ناراض کر دیا ہوگا یا پھر کسی بات پر کہا سنی ہوئی ہوگی۔ یوں تھوڑے ہی چلی جائے گی''۔

''نہیں سر، بھگوان قسم! اس کا تو میں اپنی جان سے بھی زیادہ خیال رکھتا ہوں۔ وہ کسی چیز کی فرمائش کر رہی ہوتی ہے کہ میں وہ چیز سامنے لا کر رکھ دیتا ہوں''۔

''پھر کیا بات ہے؟ کہیں کنجوسی تو نہیں کرتے۔ گھر کے خرچ کے لیے پورے روپے دیتے ہو یا نہیں؟''

''سر، میں تو ہر مہینے اپنا جیب خرچ الگ رکھ کر باقی ماندہ رقم اس کو بھیج دیتا ہوں''۔

''مار پیٹ یا گالی گلوچ......؟''

''سر، قسم ایشور کی۔ وہ کبھی جھگڑے پر بھی آمادہ ہو میں چپ رہتا ہوں''۔

''تمہارا کسی عورت کے ساتھ کوئی لفڑا تو نہیں؟''

''سر، کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ میں اور دوسری عورت! کیا پاگل کُتے نے کاٹا ہے مجھ کو؟''

''کوئی تو بات ہوگی بھئی......! میں نے آج تک ایسی عورت نہیں دیکھی ہے جو اپنے پتی کو چھوڑ کر ساس سسر کے پاس رہے۔ ہوسکتا ہے ستیہ یُگ میں کبھی کوئی عورت ہوئی ہوگی مگر اب ایسی مثالیں نہیں ملتیں''۔

امرناتھ پر تجسس نگاہوں سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے یقین ہوا کہ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں بلکہ خلوص اور ہمدردی ہے۔ انجام کار وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پایا اور رازدارانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔

''سر، دراصل بات یہ ہے کہ گاؤں میں میرا ایک بھائی ہے جو عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹا ہے''۔ امرناتھ نے اپنے آپ کو روکنے کی شعوری کوشش کی لیکن کچھ وقفے کے بعد شعور کی ساری زنجیریں توڑ ڈالیں۔

''سر، وہ میرے چھوٹے بھائی کمل ناتھ کو بہت چاہتی ہے اور اس کے بغیر رہنا نہیں

چاہتی''۔

''یہ معاملہ کب سے چل رہا ہے؟''

''جب سے ہماری شادی ہوئی ہے۔نوکری کے سبب مجھے گاؤں چھوڑنا پڑا اس لئے کمل ناتھ نے گاؤں میں آبائی کھیت کھلیان اور ڈھور ڈنگر سنبھال لیے۔ پھر گھر میں ماں باپ اور بھائی بہن بھی تو تھے۔میں تو صرف مالی امداد کرتا رہا۔

''ماں باپ کچھ نہیں کہتے؟''

''کیا کہیں گے۔انہیں یہ انتظام معقول لگتا ہے۔اس طرح گھر بھی چلتا ہے اور پھر گھر کی بات گھر ہی میں رہتی ہے۔الٹے جب میں منگلا کو چند روز کے لیے اپنے ساتھ لے آتا ہوں وہ مجھ سے خفا ہو جاتے ہیں''۔

اس کی صاف گوئی نے مجھے اور فکر مند کر دیا۔میں نے ہمت جٹا کر پوچھ ہی لیا ''بچے......؟ بچے کس کے ہیں؟''

اچانک ضمیر نے اس کی زبان کو لگام دی اور وہ چپ ہو گیا۔پھر کچھ سوچ کر جواب دینے لگا ''سر بچے......! بچے بھگوان کی دین ہوتے ہیں......اُن کا کیا......! بہر حال دنیا کی نظروں میں تو باپ میں ہی ہوں۔باقی بھگوان جانے''۔اس نے ہچکچاتے ہوئے تول تول کر الفاظ اگل دیے۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔میں اس کے ضمیر کو جگانا چاہتا تھا۔اس کی زندگی کو پٹڑی پر لانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ زہریلے ناگ کو پال رہا ہے جو کسی دن اس کو ضرور ڈس لے گا۔اس وقت وہ کہیں کا نہ رہے گا۔نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔میں امر ناتھ کو اس بات کا احساس دلانا چاہتا تھا۔اس لیے نصیحت کرنے لگا۔

''امر ناتھ......! تم چغد ہو چغد۔زندگی کے اتار چڑھاؤ سے ناواقف۔تمہیں اپنی بیوی کی سانٹھ گانٹھ کی خبر ہے نہ بھائی کے حربوں کی۔وہ دونوں جونک کی طرح تمہارا لہو چوس رہے ہیں۔ماں باپ تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔بچوں کا کیا......! وہ 'تو تا بولو گنگا رام' کہتے رہیں گے۔جیسی پٹی ماں پڑھائے گی ویسی پڑھتے رہیں گے۔اور تم! نہ گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے۔آدمی اپنا کنبہ اس لیے پالتا ہے تا کہ سکھ دکھ میں ایک دوسرے کے شریک رہیں۔بڑھاپے میں ایک دوجے کا

سہارا بنیں۔ ایک تم ہو کہ بال بچے کہیں اور تم کہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ ابھی جوان ہو۔ نبھا لیتے ہو۔ سر پر دو چار بال سفید ہو جائیں گے تب آٹے دال کا بھاؤ کھل جائے گا۔

''سر، میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں سوجھتا''۔

''تم گاؤں جاؤ اور بیوی کو کسی بھی بہانے اپنے ساتھ لے کر آؤ۔ پھر کبھی گاؤں جانے کی اجازت مت دو۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ تمہارا حق ہے''۔

''سر، میں کتنی بار اس کو اپنے ساتھ لے آیا۔ دھمکیاں دیں کہ اگر میرے ساتھ نہیں رہو گی میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔ شہر ہی میں گھر بسا لوں گا۔ پھر کیا ہوا۔ ڈھاک کے وہی تین پات۔ دس پندرہ روز آئی اور پھر چلی گئی۔ میں نے روکنے کی کوشش کی اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کئی بار پولیس تک نوبت پہنچی۔ اب آپ ہی سوچیے۔ میرے گھر کے آس پاس آفس کے لوگ رہتے ہیں۔ مارا ماری اچھی لگتی ہے کیا؟ اور پھر میری بھی تو کوئی عزت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہر بار اس کو واپس جانے دیا۔ آخر گھر کی جورو کی چوکسی کہاں تک''۔

''امرناتھ، تم ایک معمولی عورت کو نہیں روک سکتے۔ حیف کیسے مرد ہو تم!''

''ارے ساب۔ ایسی عورت سے بھگوان ہی بچائے۔ اسے آپ عورت کہتے ہیں وہ تو دس مردوں کو اکیلی پچھاڑ سکتی ہے''۔

''اگر وہ ایسی ہے پھر تم طلاق کیوں نہیں دیتے؟ جس عورت کے ساتھ آدمی خوشی سے جیون بسر نہیں کر سکتا اس سے چھٹکارا پانا ہی بہتر ہے۔ خوشحال گرہستی کے لیے پتی پتنی میں موافقت ہونا ضروری ہے''۔

''طلاق! سر، میں طلاق کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ بالکل نہیں۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟'' امرناتھ نے فقرہ بولتے وقت اپنے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ لیے۔

میرے جی میں آئی کہ کہہ دوں 'کس کے بچے، کہاں کے بچے؟'۔ لیکن یہ جلے پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہوتا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں اس کے دل کو ٹھیس نہ لگے میں نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ بہر حال قانون کی رو سے بچے امرناتھ کے تھے اور وہ بھی امرناتھ کو ہی پاپا کہتے تھے جبکہ کمل ناتھ ان کے لیے چاچا سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

ادھر کمل ناتھ کو پورا یقین تھا کہ بچے اُسی کے ہیں اور کسی کے نہیں۔ یہی سبب تھا کہ وہ بچوں کو بہت عزیز رکھتا اور انہیں پیار دینے میں کوئی بخیلی نہیں کرتا۔ عمر ڈھلنے کے باوجود اس نے منگلا کی خاطر شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ منگلا بھی اس کے ہر سکھ دکھ کا خیال رکھتی۔ بارہا کمل ناتھ کے دماغ میں خیال آتا کہ اگر منگلا مر گئی تو اس کا کیا ہوگا۔ بچے تو اپنے باپ کے پاس چلے جائیں گے۔ اس وقت وہ انہیں کیسے یقین دلا سکے گا کہ وہ اصل میں اسی کے بچے ہیں۔

دوسری طرف امرناتھ کو یہ فکر لاحق تھی کہ جب وہ ریٹائر ہو کر واپس گاؤں چلا جائے گا تو اسے اجنبیوں کی مانند اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ دونوں بھائی اپنی اپنی آگ میں جل رہے تھے مگر منہ پر تالے پڑے تھے۔

مجھے امرناتھ کے نفسیاتی تناؤ کا خوب اندازہ تھا۔ اس لیے پوچھ بیٹھا ''کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ آخر کار تمہارا کیا حشر ہوگا؟''

''سر، یہ میری مجبوری ہے۔ شادی سے پہلے ہی میری نوکری اس شہر میں لگی تھی۔ ان دنوں اتنی تنخواہ بھی نہ تھی کہ بیوی کو یہاں لا کر اس کے ساتھ گھر بسا لیتا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اپنے گاؤں تبادلہ کرواتا کیونکہ میرے آفس کی وہاں کوئی برانچ نہ تھی۔ ادھر بوڑھے ماں باپ بھی چاہتے تھے کہ بہو ان کے ساتھ رہے اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹائے۔ گھر کی زمین جائیداد کو دیکھنے والا اور کوئی نہ تھا۔ یہ تو خیر اچھا ہوا کہ کمل ناتھ نے پڑھائی چھوڑ کر کھیتی باڑی کا کام سنبھالا۔ مجھے اس بات کا گماں بھی نہ گزرا تھا کہ کبھی یہ دن بھی دیکھنے کو ملیں گے۔ سوچا تھا کمل ناتھ کی شادی ہو جائے گی اور منگلا میرے پاس آئے گی۔ کمل ناتھ اور منگلا کی آشنائی اتنی بڑھی کہ منگلا کو شہر آنے میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ بس دکھاوے کے لیے سال میں دس پندرہ روز چلی آتی یا پھر میں ہی چھٹی لے کر گاؤں چلا جاتا''۔

''یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ ٹارچر ہے ٹارچر! وہ ایک دوسرے کو جسمانی و نفسیاتی تسکین فراہم کرتے ہیں اور تم..... تم تو ذہنی اور جنسی الجھنوں کے شکار ہو رہے ہو۔ ایسے حالات میں تو مرد کبھی کبھی اپنا ذہنی توازن بھی کھو بیٹھتا ہے اور پھر آگے پہاڑ [illegible] زندگی بھی تو...''۔

''سر، کسی طرح گزر ہی جائے گی''۔

''بیوقوف مت بنو۔ عورت کنواری ہو یا بیاہی، بیوہ ہو یا سہاگن [illegible] ہو یا بوڑھی، اس کو

کہیں نہ کہیں شرن مل ہی جاتی ہے مگر مرد کو تو ملعون سمجھا جاتا ہے، اس کو کہیں بھی پناہ نہیں ملتی''۔

ایک جانب تو مجھے امرناتھ کی بے بسی اور لاچاری پر ترس آرہا تھا لیکن دوسری جانب منگلا سے بھی ہمدردی ہورہی تھی۔ نہ جانے کیا ارمان لے کر اس نے سسرال کے اندر قدم رکھا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اپنی غربت کا خیال کر کے اس نے بڑے بڑے سپنے نہیں پالے ہوں گے لیکن ایک سندر سے گھر اور پیار کرنے والے پتی کی کلپنا ضرور کی ہوگی۔ اس کے برعکس اس کو بھائیں بھائیں کرتا ہوا گوبر سے لپا پتا مکان ملا جس کی روح غائب تھی۔ منگلا پیار کی بھوکی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ امرناتھ کے بجائے اس کی جھولی میں کمل ناتھ نے ڈھیر سارا پیار ڈال دیا اور وہ اسی کی ہوکر رہ گئی۔

امرناتھ کی زندگی میں جھانک کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس بیماری کا ایک ہی علاج ہوسکتا ہے اور وہ ہے کثیر الخاوندی کو قبول کرنا اگر امرناتھ اور کمل ناتھ آپس میں مل بیٹھ کر شعوری طور پر سمجھوتا کرلیں اور منگلا کو حسب ضرورت دونوں بانٹ لیں تو سبھی لوگ خوشحال رہ سکتے ہیں اگر ایک مرد دو تین بیویاں ایک ساتھ رکھ سکتا ہے تو ایک عورت ایک ہی وقت پر دو تین خاوند کیوں نہیں پال سکتی ہے؟

پھر مجھے اپنے اُوٹ پٹانگ خیالات پر ہنسی آگئی اور میرے لاشعور نے احتجاج کیا۔ مہابھارت کی دروپدی کے ساتھ مجھے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ اس نے ایک ساتھ پانچ بھائیوں کے سنگ کیسے نباہ کیا ہوگا۔ کس کو چاہا ہوگا اور کس کو نہ چاہا ہوگا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سبھی بھائیوں کو ایک ہی پیمانے سے پیار بانٹتی اور یکساں سلوک کرتی۔ ایک عورت سے پانچ اناؤں کی تشفی کس طرح ممکن تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے ارجن کو زیادہ پیار دیا ہو۔ پھر اس بات کے لیے اس پر جنت کے دروازے بند کرنا کہاں کا انصاف تھا۔ شاید یدھشٹر انسانی فطرت کی ان باریکیوں سے ناواقف تھا۔ عورت اپنا پیار نہیں بانٹ سکتی۔ وہ اپنی جسمانی، ذہنی اور جذباتی تکمیل کے لیے ساری دنیا کو نظر انداز کر کے کسی ایک شخص سے پیار کرتی ہے۔ پھر دروپدی بھی تو گوشت پوست کی بنی ہوئی عورت تھی۔

ہم عصر سماجی تناظر میں اگر دیکھا جائے تو اس مسئلے کا حل صرف طلاق ہے اور کچھ بھی نہیں۔ مگر ایسی صورت میں کتنی زندگیاں داؤ پر لگ جائیں گی۔ کمل ناتھ، امرناتھ، اس کی بیوی اور تین

معصوم بچے جو اپنے تولد کی گتھی کبھی نہ سلجھا پائیں گے۔ وہ ساری عمر نفسیاتی امراض میں مبتلا رہیں گے۔ اس سے تو بہتر یہی ہوگا کہ منگلا دونوں کو رضامندی سے سویکار کرے۔ یوں بھی مہذب دنیا میں ایسی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں جہاں عورت اپنا جسم شوہر کے ساتھ بانٹتی ہے اور اپنی روح پریمی کے ساتھ۔

میں سوچنے لگا کہ فرض کرو وہ تینوں مان بھی جائیں کیا ہمارا معاشرہ اس کی اجازت دے گا۔ مشرقی معاشرہ تو خاص طور پر ایسا ہے کہ آئے دن پردے کے پیچھے ہو رہی بدعنوانیوں کو کسی پس و پیش کے بغیر برداشت کرتا ہے مگر کھلے طور پر ان کو قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ اسی معاشرے میں دروپدی پیدا ہوئی تھی۔ آج بھی کئی پہاڑی قبیلوں میں کثیر الخاوندی کا رواج ہے۔ اس کے باوجود ہماری ترقی یافتہ تہذیب اس رسم کی اجازت نہیں دے گی۔ بغاوت کی پاداش میں ان چھ روحوں کو سماجی بہشکار اور ترسکار کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کا جینا دوبھر ہو جائے گا اور وہ ان تہذیبی و سماجی بندشوں کے بوجھ تلے گھٹ کر مر جائیں گے۔

امرناتھ شتر مرغ کی طرح ریت میں اپنا منہ چھپائے دشمن کے وجود ہی سے منکر تھا تاہم اس کی محنت اور لگن کو دیکھ کر سارے آفس کو اس پر دَیا آتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ گم صم اور کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ وہ جسمانی طور پر آفس میں رہتا اور ذہنی طور پر اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ اس کو یہ احساس کچوکنے لگا تھا کہ اس کے پڑوسی اب اُس سے منہ پھیرنے لگے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کے گھر میں آئے۔ دھیرے دھیرے وہ بھلکڑ بھی بننے لگا تھا اور مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ فرقت کی لمبی راتوں میں اپنا غم غلط کرنے کے لیے امرناتھ نے شراب کا سہارا لیا۔ سورج ڈھلتے ہی وہ ان تلخ گھونٹوں سے اپنی زندگی کی کڑواہٹوں کو مٹانے کی ناکام کوشش کرتا۔

پھر ایک روز نہ جانے کیا ہوا۔ وہ صبح دفتر میں حاضر نہیں ہوا۔ چھٹی کے لئے کوئی درخواست بھی نہیں بھیجی۔ آفس میں سب کو چنتا ہوئی۔ دو آدمی اس کی خیر خبر پوچھنے اس کے گھر چلے گئے۔ وہاں کوارٹر تالے کے بغیر کھلا پڑا تھا۔ اندر سارا سامان بکھرا پڑا تھا جیسے کسی نے گھر کی تلاشی لی ہو۔

آخر کار امرناتھ کے ضمیر نے اس کو للکارا تھا۔ وہ نشے کی حالت میں رات کی گاڑی سے گاؤں کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ پورے سفر کے دوران اس نے شراب کی بوتل منہ سے لگائے

رکھی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنی بیوی کو پکارااور اپنے ساتھ شہر چلنے کا حکم دیا۔

خاوند کے تیور دیکھ کر پہلے تو منگلا سہم گئی بعد میں ہمت جٹا کر اس کو کوسنے لگی۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ امرناتھ نے اس کے بال پکڑ کر اُسے باہر گھسیٹ لیا اور زور زور سے مغلظات سنانے لگا۔ اتنے میں اچانک کمل ناتھ آ پہنچا اور اس نے منگلا کو اپنے بھائی کے چنگل سے چھڑا لیا۔ کچھ دیر کے بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

دن بھر امرناتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر سوتا رہا۔ شام کو جو آنکھ کھلی باہر آسمان خونچکاں ہو رہا تھا۔ درختوں کے کالے سائے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ امرناتھ کو گھر میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ ابھی پورا نشہ اترا نہ تھا۔ وہ اسی حالت میں اپنے موروثی کھیتوں کی سیر کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سگریٹ سلگایا اور اپنے پیچھے دھواں چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ منگلا اور کمل ناتھ بھی موقع کو غنیمت جان کر اس کے تعاقب میں نکل پڑے۔ کھیتوں میں آدم قد ایکھ کھڑی تھی۔ دور دور تک کسی بھی ذی روح کا سایہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہی کھیتوں کے بیچوں بیچ دونوں نے امرناتھ کو دھر دبوچا۔ کمل ناتھ نے اس کا گلا پکڑ کر منگلا سے رسّی مانگی اور پھر امرناتھ کے گلے میں لپیٹ کر اس کا دم گھونٹ دیا۔ مرتے دم تک امرناتھ بے یقینی سے دونوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

پھر انہوں نے رات کی تاریکی میں لاش کو گھسیٹ کر گاؤں کے مشترکہ کنویں جس کے پانی سے مویشوں کا پیاؤ بھرا جاتا تھا، میں پھینک دیا۔ اور دبے قدموں واپس چلے آئے تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ آج تک امرناتھ کی موت کا راز راز ہی رہا حالانکہ دوسرے روز ہی کنویں نے لاش اُگل دی اور وہ سطح پر تیرنے لگی۔ کیس کی کسی نے زیادہ پیروی نہیں کی اس لیے پولیس نے خودکشی کا کیس بنا کر فائل بند کر دی۔

کمل ناتھ اور منگلا نے دو سال بعد ہی آپس میں باضابطہ شادی کر لی۔

اب کمل ناتھ منگل کا پتی پرمیشور کہلاتا ہے گو بچے پھر بھی کمل ناتھ کو چاچا کے نام ہی سے پکارتے ہیں۔ منگلا کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ اُسے پاپا کہنے کو تیار نہیں ہوتے۔

●□●

# چڑی کی بیگم

°

میرے دوست نے پہلی نظر میں اس کا نام 'چڑی کی بیگم' رکھ دیا۔ ابھی میں نے کال بیل کا سوئچ دبایا ہی تھا کہ جیون لال نے لپک کر اپنے فلیٹ کا صدر دروازہ کھولا لیکن میرے ہمراہ اس لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ میرے ساتھ کوئی لڑکی ہوگی اور وہ بھی الٹے توے جیسی کالی۔ لڑکی کا نام شیاملی تھا اور وہ نیلور، آندھرا پردیش کی رہنے والی تھی۔

شیاملی کے سیاہ چہرے کو نرم نرم روؤں اور کیل مہاسوں نے بدنما بنا دیا تھا۔ مہیب شکل وصورت نے اس کی شخصیت کے دوسرے جاذب پہلوؤں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ کسرتی بدن، متناسب اعضاء، موٹے موٹے رسیلے ہونٹ اور نشیلی آنکھیں۔ اس پر طرہ یہ کہ جب بھی وہ اپنے معطر چمکدار بالوں کو کھول دیتی تو وہ اس کی پنڈلیوں تک لہراتے۔ اس کے علاوہ ایشور نے اسے کویل کی مانند سریلی آواز سے بھی نوازا تھا۔

اپنے غریب ماں باپ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے وہ نوکری کی تلاش میں دلی چلی آئی تھی۔ یہاں دو اور دکنی لڑکیوں کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔ گریجویٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے ٹائپ شارٹ ہینڈ میں بھی کافی مہارت حاصل کی تھی۔ اسی لیے نوکری ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

شیاملی کو بھگوان سے دو ہی شکایتیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ غریب گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور دوسری یہ کہ وہ سیاہ فام تھی۔ بچپن ہی سے وہ ان دونوں کوتاہیوں سے جوجھ رہی تھی۔ غربت کا ازالہ کرنے کے لیے وہ رات دن محنت کرتی۔ دن بھر آفس کا کام کرنے کے بعد وہ سیدھے ایس این داس گپتا کالج پہنچ جاتی جہاں وہ سول سروسز امتحانات کی تیاری کرتی۔ پھر گھر لوٹ کر وہ آدھی رات تک پڑھائی کرتی۔ جہاں تک بدرنگی کا سوال تھا اس کا توڑ تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔ تاہم وہ چہرے اور مہاسوں کے نت نئے لوشن لگا کر ہر شب یہ سوچ کر سو جاتی کہ صبح تک

اس کا چہرہ گورا اور ملائم ہو چکا ہوگا۔

شیا ملی کے ساتھ میری ملاقات ایس این داس گپتا کالج میں ہوئی۔ مجھے اس بات کا گماں بھی نہ تھا کہ وہ ہسٹری کلاس میں مجھے گھورتی رہتی ہے۔ اس روز میں لیکچر کے دوران اچانک پیچھے مڑا اور میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جا ٹکرائیں۔ اس طرح اس کی چوری پکڑی گئی۔ میں نے مذاق کے طور پر اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیر دی مگر وہ اس کا کچھ اور ہی مطلب سمجھ بیٹھی۔ میری اس خفیف سی مسکراہٹ نے گویا اس کی حوصلہ افزائی کر دی۔ کلاس سے چھوٹتے ہی اس نے مجھے راہداری میں روک لیا۔ اس وقت اس کے ہمراہ ایک اور ہم جماعت تھی۔

''ہیلو......'' شیا ملی نے بے تکلفی سے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھایا۔

''ہیلو......'' میں نے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے بے دلی سے اپنا ہاتھ پیش کیا۔

''لاسٹ منڈے کو آپ نے کہا تھا کہ آپ کے پڑوس میں کہیں کرائے کے لیے کمرہ خالی ہے۔ اس کا کیا ہوا؟'' شیا ملی نے مجھ سے پوچھا۔

کس روز......؟ کون سا کمرہ......؟ میں تو اس لڑکی سے پہلی بار مل رہا ہوں۔ پھر وہ کیا کہہ رہی ہے......! میں تذبذب میں پڑ گیا۔

شیا ملی نے خود ہی حالات کو سنبھالا۔ آنکھ مار کر اپنی سہیلی کی طرف اشارہ کیا اور میں سمجھ گیا کہ وہ اس کی موجودگی میں اپنے دل کی بات نہیں کہہ پا رہی ہے۔ میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

''ہاں، بات کی تھی مگر جواب دو تین روز کے بعد ملے گا۔''

''آپ فری ہو گئے یا اور بھی کوئی کلاس باقی ہے؟'' اس نے ایک اور سوال کیا۔

''اس کے بعد پولیٹیکل سائنس کی کلاس ہے۔'' میں نے پھر جواب دیا۔

''تب تک میں باہر گیٹ کے پاس آپ کا انتظار کروں گی۔'' وہ میرا جواب سنے بغیر ہی وہاں سے چل دی اور مجھے قیاسی دنیا میں چھوڑ گئی۔

کلاس ختم ہوتے ہی جب میں باہر نکلا تو وہاں شیا ملی کو منتظر پایا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ساتھ کوئی جونک چمٹ گئی ہو۔ اس وقت مجھے فرار کا کوئی راستہ نہیں سوجھا۔ لہٰذا بوجھل قدموں سے اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اکیلی تھی۔ بالکل اکیلی۔

''آپ......آپ کو میں بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ کلاس میں بات کرنے کا موقع ہی

نہیں ملتا اس لیے بہانہ ڈھونڈنا پڑا۔ آپ کو برا تو نہیں لگا؟''

''نہیں، اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے۔'' میں نے ہنس کر اس کی بات ٹال دی۔

''ڈونٹ مس انڈراسٹینڈ می ڈیر۔ دراصل میں نے جب پہلی بار آپ کو دیکھا نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک طوفان سا اٹھ آیا۔ تب سے میں آپ کو رات دن دیکھنا چاہتی ہوں۔ آئی لو یو ڈیر۔''

اس کی باتیں سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس پر ترس بھی آیا۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا اور پھر اپنے آپ سے ہمکلام ہوا''پیار اور اس لڑکی سے......! نہ شکل نہ صورت......! کیا سمجھتی ہے وہ اپنے آپ کو؟ اس کو اپنی حقیقت معلوم نہیں؟ اس کو پیار جتانے کی ہمت کیسے ہوئی؟'' میں نے من ہی من اس بلا سے چھٹکارا پانے کی سبیل کر لی۔ اپنے چہرے پر متانت کا خول چڑھا کر میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

''پیار......! میں پیار ویار کا قائل نہیں۔ عملی قسم کا آدمی ہوں۔ یہ افلاطونی پیار کے قصے مجھے راس نہیں آتے۔ آخر کار بات وہیں پہنچ جاتی ہے۔ یعنی سیکس پر۔ میرے پاس ان فالتو چیزوں کے لیے کوئی وقت نہیں۔ ہاں اگر سیکس چاہیے تو میں حاضر ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔''

''آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں؟ میں کوئی گری ہوئی لڑکی نہیں ہوں۔ اپنے دل کی بات کا اظہار کرنا کوئی گناہ تو نہیں۔''

''میں نہ تو آپ کی بے عزتی کر رہا ہوں اور نہ ہی آپ کو بری لڑکی سمجھتا ہوں۔ میری مجبوری صرف یہ ہے کہ میں صاف گو ہوں۔ مجھے افلاطونی پیار پر یقین ہے نہ بھروسہ۔ اگر آپ میری بات کا برا مان گئیں تو معاف کر دیجیے۔'' میں نے سوچا تھا میرا درشت جواب سن کر وہ برانگیختہ ہو جائے گی۔ شاید دو چار گالیاں بھی سنائے گی۔ اسی بہانے چھٹکارا تو مل جائے گا لیکن اس کا ردعمل کچھ اور ہی تھا۔ اس نے بڑی ندامت سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی۔'' اتنا کہہ کر وہ نزدیکی بس اسٹاپ کی جانب چل دی۔

میں مصلحتاً وہیں رکا اور اس کے بس میں چڑھنے کا انتظار کرتا رہا تاکہ اس کے بعد اطمینان سے اپنی بس پکڑ لوں۔ کچھ توقف کے بعد وہ پلٹ کر میرے پاس لوٹ آئی اور بڑے ہی اعتماد سے گویا ہوئی۔

''آپ بہت ہی سنگدل ہیں۔ کٹھور اور بے مروت بھی! اگر آپ کو سیکس ہی چاہیے تھا کم سے کم میرا دل رکھنے کے لیے تھوڑا بہت پیار کا اظہار تو کیا ہوتا۔''

''یہ ناٹک بازی مجھے نہیں آتی''۔

''میں سمجھ گئی۔ آپ کا جواب سن کر میں مایوس ضرور ہوئی لیکن آپ سے الگ ہونے کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ آپ دوغلے آدمی کبھی نہیں ہو سکتے۔ آپ کے اندر جو ہے وہی باہر بھی ہے۔ یہ عمر ہی ایسی ہے کہ جسمانی بھوک مٹانے کے لیے ہر آدمی بیقرار رہتا ہے۔ چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ پھر آپ سے کیا گلہ۔ آپ کو سیکس چاہیے نا! ٹھیک ہے۔ میں حاضر ہوں۔ ابھی اور اسی وقت......!'' میرا فقرہ دہراتے وقت اس کے لبوں پر فتنہ انگیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

شیاملی کی بے باک پیش کش نے میرے ہوش وحواس اڑا دیے۔ حالات یوں کروٹ لیں گے مجھے گماں بھی نہ تھا۔ گیند اب میرے کورٹ میں تھا اور فیصلہ بھی مجھے ہی کرنا تھا۔ میں نے آگا پیچھا دیکھے بغیر اس کو اپنے ناکتخدا دوست جیون لال کے گھر پہنچایا جدھر میں خود سول سروسز کی تیاری کے لیے عارضی طور پر مقیم تھا۔ دروازہ کھلتے ہی میں تیز تیز قدموں سے اپنے پڑھائی کے کمرے میں گھس گیا اور شیاملی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

کمرے کا نقشہ دیکھ کر اس کو تعجب ہوا۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور اپنائیت سے پوچھ بیٹھی۔ ''یہ تمہارا کمرہ ہے؟''

''ہاں......اور کس کا ہوگا''۔

''یہ کتابیں، یہ نوٹس، یہ قلم، پنسل، کاغذ...... یہ سب تمہارے ہیں؟

''کیوں تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے؟''

''تمہارے طرز کلام سے میں سمجھ بیٹھی تھی کہ تم کوئی بگڑے دل شہزادے ہو جو محض تفریح کے لیے کالج آ رہا ہے لیکن یہ کمرہ تو الگ ہی منظر دکھا رہا ہے''۔ شیاملی بلا تکلف میرے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''جیسا چاہو سمجھ لو۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے تخاطب کی چبھن ابھی بھی تمہارے دل میں ہے۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میرے دل میں جو بات آئی وہ میں نے کہہ دی۔'' اس نے میز پر

رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا اٹھالی۔اس میں سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر میری طرف بڑھادیا۔

''لو پی لو۔ مجھے سگریٹ پیتے ہوئے مرد بہت اچھے لگتے ہیں۔'' میں نے اپنی انگلیوں میں سگریٹ پکڑ لیا اور مسلسل کش پر کش لگا تا رہا۔ کمرے میں دھوئیں کے بادل تیرنے لگے۔ دفعتاً اس نے بھی سگریٹ چھین کر پینے کی کوشش کی مگر وہ پیتی کم تھی اور کھانستی زیادہ۔

کئی بار اسے یوں محسوس ہوا کہ میری نظریں اس کے پیراہن کو چیر کر اسے عریاں کر رہی تھیں۔ وہ لجائی اور یکبارگی اٹھ کر کھڑکیوں کے پردے گرادیے۔ شاید اس کے دل کے کسی گوشے میں اپنی تحقیر کا احساس ابھر آیا تھا اور وہ دن کے اجالے میں اسے برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے باوجود کمرے میں ہلکی دودھیا روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ بہر حال میرا اشارہ پاتے ہی وہ جھینپتی ہوئی پیاز کے چھلکوں کی طرح اپنے کپڑے اتارتی گئی۔ اندر سے سانولے رنگ کا کسا ہوا، چکنا اور متناسب جسم ابھرتا گیا جس کی مخصوص مہک سے میرا سارا وجود ملفوف ہو گیا۔ بدن فضول بالوں اور غیر ضروری چربی سے عاری تھا جس پر میری نظریں پھسل پھسل رہی تھیں۔ بیڈ پر جو لیٹی تو ایسا لگا جیسے کالے گیسوؤں کی سیج پر زلیخا لیٹی ہوئی ہو۔ اس کا سارا وجود شعلہ بار تھا۔ چڑی کی بیگم اس ہیجان کا سبب بن جائے گی مجھے اس کا وہم و گماں بھی نہ تھا۔ محض ایک لمس نے ساری کائنات پلٹ دی۔

اس واقعہ کے بعد حالات نے عجیب سی کروٹ لی۔ ہم دونوں اپنے جسم بھول گئے اور ہماری روحیں آپس میں ہمکلام ہوتی گئیں۔ عام طور پر محبت پہلے ہوتی ہے اور صحبت بعد میں۔ یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ وہ جسم کے توسل سے میری روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ وقت بھی دبے قدموں گزرتا چلا گیا۔ امتحان میں وہ ناکام رہی جبکہ میں کامیاب ہوا۔ نتیجتاً مجھے ٹریننگ کے لئے مسوری جانا پڑا۔ مجھے اس بات کا احساس ستانے لگا کہ میری خوشیوں کی خاطر شیاملی نے اپنا ذاتی کیریئر قربان کر دیا۔ پھر اس کے خط آنے لگے جنہیں میں اپنی بیوی کے خطوط پر ترجیح دیتا رہا۔ ایک طویل خط میں اس نے اپنی پوری زندگی کی کتاب کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ مجھے کملا داس کی مشہور سوانحاتی ناول 'میری کہانی' کے وہ الفاظ یاد آ گئے۔ ''میرا جی کرتا ہے کہ میں اپنے جسم کے ہر ایک عضو کو کاٹ کر کینواس پر سجا دوں اور اس کا ایک کولاج

بنا دوں تا کہ لوگوں سے کچھ بھی چھپا نہ رہے۔'' چڑی کی بیگم نے بھی میرے سامنے ایسا ہی ایک کولاج ٹانگ دیا تھا۔

بچپن میں اس کو ایک پڑوسی لڑکے سے پیار ہوا تھا۔ سمندر کے ساحل پر دونوں ریت کے گھروندے بنایا کرتے تھے۔ پھر ایک روز نیلور کے مشرقی ساحل پر زبردست سائیکلون آیا اور معصوم پرساد سمندر کی موجوں میں بہہ گیا۔ شیاملی اسے اپنے کوٹھے سے لاچار دیکھتی رہی۔ اس کے بعد وہ اپنے دوست کو خوابوں میں تلاشتی رہی۔ اس کی تصویر کو کرشن کا روپ دے کر کینواس پر اتارتی رہی۔ ان تصویروں میں وہ رنگ تو بھر دیتی تھی مگر ان میں جان ڈالنے سے قاصر تھی۔

جن دنوں وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی اس کے دانتوں میں اچانک شدید درد اٹھا۔ وہ علاج کے لیے دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ ڈاکٹر ریڈی نے معائنہ کرتے وقت اس کے شہوت بھرے ہونٹوں کو چوم لیا۔ اس پہلے بوسے نے شیاملی کو تڑپا کے رکھ دیا۔ وہ بار بار دانت درد کا بہانہ کر کے ڈاکٹر ریڈی کے کلینک پہنچ جاتی اور ڈاکٹر ریڈی اس کی معصومیت اور کم سنی کا فائدہ اٹھاتا رہا۔ وہ شیاملی کے وجود کا محور بن گیا۔ ابھی سال بھی نہ گزرا تھا کہ ڈاکٹر نے اپنی ایک رفیق کار سے شادی کر لی اور ویلور جا کر اپنی سسرال میں ڈیرہ جما لیا۔

شیاملی کی زندگی کا کینواس اب دلی کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ دلی میں گورے پنجابی چہروں کی کثرت تھی۔ آتے ہی اپنے ایمپلائر اگروال سنز کے پراپرائٹر سے دوستی ہوئی مگر وہ یگانگت پیدا نہ ہوئی جس کی وہ متقاضی تھی۔ اس لیے بات آگے نہ بڑھی۔ شیاملی کو جس خلوص اور محبت کی خواہش تھی وہ اس شہر میں نایاب تھی۔

اس کی زندگی کے البم کو دیکھ کر مجھے یقین ہوا کہ اتنے معاشقوں کے باوجود وہ بھولی بھالی تھی اور زندگی کے اتار چڑھاؤ سے بے خبر۔ وہ ایسے انسان کی متلاشی تھی جو اس کی صورت کو نظر انداز کر کے اس کی سیرت کی قدر کرتا۔

مسلسل تبادلوں کے باعث میں اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ تین سال میگھالیہ میں تعینات رہا اور پھر مزید تین سال آسام میں گزارے۔ بال بچے ساتھ تھے اس لیے کبھی دلی جانے کی ضرورت بھی نہ پڑی۔ اسی وجہ سے خط و کتابت بھی منقطع ہو گئی۔

پھر چھ سال کی طویل مدت کے بعد مجھے ٹریننگ کورس کے لیے دلی جانا پڑا۔ وہاں پہنچ کر

معلوم ہوا کہ جیون لال نے پنجابی باغ میں اپنا ایک فلیٹ خرید لیا ہے اور شادی بھی کر لی ہے۔ پہلی فرصت میں اس سے ملنے چلا گیا۔ کال بیل بجائی۔ چند ثانیوں کے بعد دروازہ کھُلا اور سامنے چڑی کی بیگم نے میرا سواگت کیا۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اتنی دیر میں اندر سے جیون لال کی آواز سنائی دی۔

''ارے یار۔ اندر بھی آؤ گے یا وہیں کھڑے رہو گے''۔

میں ڈرائنگ روم میں جا کر صوفے پر جا بیٹھا۔ میری صورت دیکھ کر جیون لال بھانپ گیا کہ میں کس مخمصے میں گرفتار ہوں۔ بے باکی سے کام لیتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

''اچنبھا ہو رہا ہے کیا؟ یہ شیاملی ہے شیاملی۔ جس کو میں نے چڑی کی بیگم کا لقب دیا تھا۔ اب میری بیوی ہے۔''

دریں اثنا شیاملی کچن کے اندر چائے ناشتہ تیار کرنے کے لیے چلی گئی۔ جیون لال کی باتیں سن کر میرے چہرے پر استفسار اور تجسس کے آثار خود بخود نمودار ہو گئے جس کا اندازہ لگانا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ میرے پوچھے بغیر ہی وہ مزید وضاحت کرنے لگا۔

''یار، ہوا یوں کہ تمہارے چلے جانے کے بعد شیاملی کبھی کبھار مجھ سے ملنے آ جاتی تھی اور ہم دونوں گھنٹوں بیٹھ کر تمہارے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اس کے خلوص اور پیار کو دیکھ کر میں اس کا قائل ہو گیا۔ تم تو شادی شدہ تھے، اپنی دنیا میں کھو گئے۔ تم نے شیاملی کو بالکل فراموش کر دیا اور وہ اس بھری دنیا میں تنہا پڑ گئی۔ اس کا اب اس دنیا میں کوئی بھی نہیں۔ میری ہمدردی کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ میرے قریب تر آنے لگی۔

تمہیں معلوم ہے کہ میری زندگی میں کتنی عورتیں آ چکی ہیں مگر شیاملی کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ وہ ساقی ہے جس کے ہاتھ سے ایک ساغر پی لو تو سارا مے خانہ لوٹنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یار سچ بتاؤں۔ اگر میں مرنا چاہوں تو یہ مجھے مرنے بھی نہ دے گی۔''

''مگر یار زندگی میں سیکس ہی سب کچھ نہیں ہے۔ بیوی کے اور بھی فرائض ہوتے ہیں۔''

''یہیں پر ہم لوگ مات کھاتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی لڑکیاں جن کے بدن سے شرارے اٹھتے ہیں بیوی بننے کے قابل نہیں ہوتیں۔ غلط، بالکل غلط۔ میری ازدواجی زندگی اس کی سند ہے۔ ایسا کوئی وصف نہیں جو میری بیوی میں نہیں ہے۔ اب تو ہمارے دو بچے بھی

ہیں۔ ذہین اور تیز فہم۔ تم انہیں دیکھو گے تو حیران ہو جاؤ گے۔ میں شیاملی کو پا کر اپنے آپ کو بہت ہی اقبال مند سمجھتا ہوں۔''

''یہ جان کر بھی کہ وہ...... میرے......'' میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا تاہم بیچ میں ہی اپنی زبان کو مصلحتاً روک لیا۔

''ہاں یہ جان کر بھی۔ جوانی میں کس سے لغزش نہیں ہوتی۔ جب تمہیں اور مجھے حق حاصل ہے تو عورتوں کو کیوں نہیں۔ یہ تو اتفاق سمجھو کہ مجھے اس کی بیتی ہوئی زندگی کا علم ہے ورنہ ارینجڈ میرج ہوتی تو مجھے اس کے ماضی کے بارے میں کہاں جانکاری ہوتی۔ دراصل ہم مشرق کے باشندے حقیقت سے آنکھیں چار نہیں کر سکتے۔ عمر بھر خوش فہمیوں میں جینا پسند کرتے ہیں۔ میں ان معمولی چیزوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔''

اتنی دیر میں شیاملی چائے کی ٹرے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی اور چائے کے کپ میز پر قرینے سے سجانے لگی۔

جیون لال کو نہ جانے کیا سوجھی۔ شیاملی کی طرف دیکھ کر بول اٹھا۔ ''دوست، یاد ہے اس محبوبہ کو پہلی بار تمہارے ساتھ دیکھ کر میں نے کون سا نام دیا تھا؟''

اور پھر خود ہی بولنے لگا۔

''چڑی کی بیگم۔ ہے ناواقعی چڑی کی بیگم جیسی میری محبوبہ''۔ اس کی بات سن کر ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

●□●

# زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

''سڑک پار کروں یا نہ کروں؟'' وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

گاڑیوں کا کارواں رُکنے کا نام بھی نہیں لے رہا تھا۔ اصول کے مطابق زیبرا کراسنگ کے پاس گاڑیوں کی رفتار خود بخود دھیمی ہونی چاہیے اور وقتِ ضرورت اُن کو رُک بھی جانا چاہیے تاکہ پیدل چلنے والے مسافر سڑک پار کر سکیں لیکن وہ اپنی ہی لے میں چلی جا رہی تھیں۔ آگے پیچھے روکنے والا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ حوالدار اور نہ ہی لال بتی۔ رہی خود ضبطی کی بات وہ تو اس ملک میں سرے ہی سے مفقود ہے۔ سبھی ایک دوسرے کو پچھل کر سبقت لینا چاہتے ہیں۔

عام طور پر سڑک پار کرنے والے راہگیر اتنے فکر و تردد میں نہیں پڑتے۔ دو گاڑیوں کے درمیان تھوڑا بہت فاصلہ دیکھا، جلدی سے راستہ پار کر لیا۔ بہر حال اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس کو سڑک پار کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے گاڑیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور وہ مسلسل زنجیر بناتی ہوئی چلی جا رہی تھیں۔ آٹو رکشے، کاریں، جیپیں، لاریاں، موٹر سائیکلیں اور سکوٹر۔ سبھی گاڑیاں ہوا کی رفتار سے چلی جا رہی تھیں۔ اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بیچ سڑک پر کوئی گاڑی ضرور اس کو کچل کر چلی جائے گی۔ وہ ایسی ہولناک موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

وہ جس جگہ سے آیا تھا یا یوں کہیے یہاں آنے پر مجبور ہوا تھا وہاں سرمئی سڑکوں پر سفید دھاریاں بنانے کا رواج نہیں تھا۔ اس قصبے کے پوش ایریا میں صرف دو ایک چوراہوں کے نزدیک ایسی دھاریاں آمد و رفت کی تعدیل کے لیے کم اور محض فیشن کے لیے زیادہ بنائی گئی تھیں۔ وہ جدھر مرضی ادھر سڑک پار کر لیتا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑیاں خود ہی اس کو راستہ دینے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔

زیبرا کراسنگ کی سفید اور سیاہ دھاریاں اُسے ترغیب دے رہی تھیں کہ تم بس چلنا شروع کر دو، سڑک خود ہی پار ہو جائے گی۔ تمہارا کچھ بھی نہ بگڑے گا۔ یہ زیبرا کراسنگ بنی ہی اس لیے ہے کہ پیادہ سڑک پار کر سکیں۔ ان دھاریوں پر چلنے کا پہلا حق پیدل چلنے والوں کا بنتا ہے۔ انہیں

ترجیح ملتی ہے۔ ان مسافروں کو راستہ دینا ہر ڈرائیور کا فرض بنتا ہے۔

''فرض......!'' اس کے من میں جھلاہٹ سی پیدا ہوئی۔ ''اس زمانے میں فرض کو کون پوچھتا ہے۔ ہر سو چوہوں کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے کا حق مارنے پر تُلا ہوا ہے۔ اس دوڑ میں کہیں کوئی مسافر گھایل ہو یا پھر مَر بھی جائے تو کونسا پہاڑ ٹوٹ جائے گا۔ ایک اور موت سے اس شماریاتی نظام کا کچھ نہیں بگڑے گا''۔

سامنے سے ایک مرسڈیز ہارن بجاتی ہوئی تیزی سے نکل گئی۔ اس نے گھبراہٹ میں اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے۔ سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ ماضی کو کریدنے لگا۔ اس کے بیٹے کی لاش اس کی آنکھوں کے سامنے بے حس و حرکت پڑی تھی۔

اس حادثے میں زیادہ دن نہیں گذرے تھے۔ اس کے بیٹے نے بھی سڑک پار کرنے کی کوشش کی تھی۔ کسی نامعلوم ٹرک نے اسے کچل ڈالا تھا۔ خون میں لت پت لڑکے کی لاش رات بھر سڑک پر پڑی رہی۔ دوسرے روز پولیس نے پرچہ چاک کیا۔ دن بھر تفتیش چلتی رہی۔ تب کہیں پنچ نامہ ہوا۔ آخر کار ڈھاک کے وہی تین پات۔ مارنے والے کا کہیں نام و نشان بھی نہ ملا۔ پولیس چاہتی تو مل بھی سکتا تھا مگر وہ خوامخواہ اس جھنجھٹ میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے پاس اور بھی بہت سارے اہم کیس تھے جن کی پیروی وی آئی پی کر رہے تھے۔ یہ تو خیر ہوئی کہ مرنے والے کی ڈائری سے اس کے گھر کا پتہ مل گیا ورنہ لاوارث سمجھ کر ٹھکانے لگا دیتے۔ رات گئے پولیس لاش کو لے کر گھر میں وارد ہوئی۔

گھر...... ! اسے گھر کہنا تو سراسر زیادتی ہوگی۔ پھٹے پرانے چیتھڑوں کے پیوند لگے ہوئے خیمے کو کوئی گھر کیسے کہہ سکتا ہے۔ گھر تو وہ تھا جو یہ لوگ اننت ناگ میں چھوڑ کر آئے تھے۔ تین منزلہ مکان، عمدہ سبز پتھروں کی بنی ہوئی اس کی کرسی، پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی دیواریں، چیڑ کی بنی ہوئی کمروں کی نقش دار چھتیں، دیودار کی کھڑکیاں اور دروازے اور ٹاٹا ٹین سے ڈھکی مکان کی ڈھلوان چھت جس پر جاڑوں میں برف پھسل پھسل جاتی تھی۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ دور دور تک ہرے بھرے لہلہاتے دھان کے کھیت تھے جن کی فصیلیں قدرت نے نیلے اودے پہاڑوں سے بنائی تھیں۔ سامنے صحن میں اخروٹ کے دو بڑے بڑے درخت تھے جن کے سائے میں پتھر کا بھاری بھرکم اُکھل پڑا رہتا تھا۔ پاس ہی مویشیوں کے چارے کے لیے

ایک شیڈ بنا ہوا تھا جس کے نیچے پانچ فٹ لمبے چوبی موسل دیوار کے سہارے ٹکے رہتے تھے۔ خزاں کے موسم میں گھر کی عورتیں بڑے چاؤ سے اس اُکھل میں شالی، مصالحے اور لال مرچیاں کوٹتی تھیں۔ اس وقت ان کے منہ سے مدھر کشمیری گیت سنتے ہی بنتا تھا۔ ادھر عقبی حصے میں سیب، بادام، آلو بخارا اور آڑو کے بے شمار درخت لگے ہوئے تھے جن کے شگوفے ہر آنے جانے والے کا دل موہ لیتے تھے۔ سال بھر کا اناج، دالیں، سبزیاں اور پھل پھول اپنے کھیتوں ہی سے دستیاب ہوتا تھا۔ ایسی صورتحال میں اس کو اپنے گھر سے کبھی باہر جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ حالانکہ کئی بار من میں خیال آیا تھا کہ چار دھام درشن کر کے سورگ سدھارلے لیکن گرہستی نے جکڑ کر رکھا تھا۔ پوری زندگی میں اس نے جو بڑے سے بڑا شہر دیکھا تھا وہ سرینگر تھا جہاں اُن دنوں تانگوں کا عام چلن تھا۔ کاریں، لاریاں اور ٹیمپو تو خال خال ہی نظر آتے تھے۔ ریل گاڑی تو اس نے ہجرت سے پہلے کبھی دیکھی بھی نہ تھی۔

"میں بھی کیسا پاگل ہوں۔ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اب تو وہ گھر خواب ہوگیا۔ بس ایک خواب اور کچھ بھی نہیں۔ یہ لوگ اس ٹینٹ کو گھر کہتے ہیں۔ اس سے بہتر تو میرے آبائی گھر کی گئوشالہ تھی"۔

اسے دوبارہ اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کی صورت یاد آگئی۔ اٹھتی جوانی، گوری دودھیا جلد، چم چم کرتی نیلی آنکھیں، برگ گل جیسے گال اور قد کاٹھ ایسا کہ سفیدہ بھی شرما جائے۔ صورت تو صورت، سیرت سے بھی بھلا مانس لگتا تھا۔ صرف ایک کسر تھی اس میں اور وہ تھی زود حسی کی۔ وہ ہر وقت فکر و تردد کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا رہتا تھا۔ بیتا ہوا سنہری کل، غیر اطمینان بخش آج اور آنے والا غیر موافق کل اس کے ذہن کے اختلال کے باعث تھے۔ شاید حادثے والے دن بھی وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا سڑک پار کر رہا ہوگا اور کوئی تیز رفتار ٹرک اس کو روند کر چلا گیا ہوگا۔

فکر و تردد تو اس سمٹتی سکڑتی قوم کا للاٹ بن چکا ہے۔ اس سے کسی کو چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ یہ ترکہ وہ اپنے بچوں کے لیے بھی چھوڑ کر جائیں گے۔ جب تک پوری قوم سمٹتے سمٹتے صرف تواریخ کے پنوں تک محدود رہ جائے گی۔

اس آدمی نے اپنا سر ایسے جھٹکا جیسے ان الجھیڑ دل کو اپنے دماغ سے باہر نکال کر پھینکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے سامنے زیبرا کراسنگ پر نظر دوڑائی۔ وہ پہیے کی مانند ہی تپتے سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی اور اس پر گاڑیوں کی آمد و رفت بدستور جاری تھی۔

راہ رو نے ہمت جٹا کر اپنا دایاں پیر پھر آگے بڑھایا۔ سامنے سے ایک فراٹے بھرتی ہوئی موٹر سائیکل شوں کر کے نکل گئی۔ اگر وہ وقت پر اپنا پاؤں پیچھے نہیں ہٹا لیتا تو شاید موٹر سائیکل اس کے پاؤں کے اوپر سے نکل جاتی۔ موٹر سائیکل والے نے پیچھے مڑ کر اس کو دو چار گالیاں دے دیں۔ وہ بہت پریشان ہو رہا تھا کہ سڑک کیسے پار کرے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا اور کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

جون کا مہینہ تھا۔ اوپر سوا نیزے پر سورج آ چکا تھا۔ وہ پھر بھی طے نہیں کر پا رہا تھا کہ سڑک کب اور کیسے پار کرے۔ بال بچوں نے کتنی بار سمجھایا کہ اس کڑی دھوپ میں باہر مت نکلا کرو۔ آپ کی عمر اس قابل نہیں ہے کہ ایسی گرمی برداشت کریں مگر وہ کہاں ماننے والا تھا۔ دیہاتی لوگوں کو اپنی تندرستی پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو وہ تفریح کے لیے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ اس کو ریلیف کی رقم حاصل کرنے کے لیے دس کلومیٹر دور جانا تھا۔ پہلے سولہ سو ملتے تھے۔ بیٹے کی موت کے بعد اب بارہ سو ہی ملنے لگے تھے۔ پہلے بیٹا گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ بازار سے سودا سلف لاتا تھا اب وہ کام بھی خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ بس ریلیف کا ہی سہارا تھا۔ وہ پیشے کا کسان تھا۔ جو کچھ تھا سب وادی میں رہ گیا تھا۔ اگر نوکری پیشہ ہوتا تو تنخواہ چالو رہتی لیکن دہقانوں کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ آبائی گھر میں تین بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ اجڑ کر تینوں تین دشاؤں میں بکھر گئے۔ بہر حال اپنے کنبے کو صحیح سلامت لے آیا تھا یہی کیا کم تھا۔ بیوی، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں، بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ جس اجل کے ڈر سے وادی سے بھاگ آیا تھا وہی اجل یہاں چوراہے پر منتظر اس کے بیٹے کو اپنا لقمہ بنا دے گی۔

ریلیف......! اور یہ ادھڑا ہوا ٹینٹ......! سر کے اوپر اپنی چھت تھی نہ پاؤں کے نیچے اپنی زمین تھی۔ اس پر اتنے سارے منہ مدعی بنے بیٹھے تھے۔ کہاں تو اناج کے انبار لگے رہتے تھے اور کہاں یہ کسمپرسی۔ گھر میں ہر روز ایک دو آدمیوں کے لیے فالتو کھانا پکتا تھا۔ کیا معلوم کب کون سا مہمان آ ٹپکے۔ جب کبھی کوئی بن بلایا مہمان آ جاتا دستر خوان بچھانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ اب سارا کنبہ دانے دانے کا محتاج ہو چکا تھا۔ بارہ سو کی ریلیف میں سے ریلیف کمشنر آفس کا کلرک پہلے ہی سے ایک سو روپیہ کم پکڑا دیتا تھا۔ پھر گیارہ سو میں چار افراد کا کھانا پینا، کپڑا لتہ، دوا دارو اور بچوں کی تعلیم کا خرچہ کہاں سے نکلتا۔ بیوی ان پڑھ تھی۔ کوئی کام یا ہنر نہیں جانتی تھی۔ اُس بیچاری

کو کیا معلوم تھا کہ ایسے بھی دن آئیں گے۔ بیٹے پر آس لگائے بیٹھا تھا وہ گریجویشن سے پہلے ہی بھگوان کو پیارا ہو گیا۔ اب دو بیٹیاں بچی تھیں۔ پہلی نویں میں پڑھتی تھی اور دوسری آٹھویں میں۔

اچانک اس کو بیوی کی تاکید یاد آ گئی۔ گھر سے نکلتے سمئے بیوی نے اصرار کیا تھا کہ دوپہر کے کھانے سے پہلے ہی گھر لوٹ آنا۔ دھوپ سے بچنے کے لیے گیلی تولیہ بھی ساتھ دی تھی۔

اس نے پاس ہی پانی بیچنے والے سے ٹائم پوچھا۔

''سوا ایک بجے ہیں''۔ فوراً جواب ملا۔ پانی بیچنے والا اس کو بہت سمئے سے دیکھ رہا تھا اور شاید اس کی کیفیت کا اندازہ لگا چکا تھا۔

وہ ٹھٹھک گیا۔ کافی وقت سے وہ اسی جگہ پر کھڑا تھا اور کچھ طے نہیں کر پا رہا تھا۔

''بابو جی، آپ بہت دیر سے اس کڑکتی دھوپ میں کھڑے ہیں۔ آخر آپ کو کہاں جانا ہے''؟ پانی بیچنے والے کو بوڑھے پر ترس آیا۔

''سڑک پار کرنی ہے مگر یہ ٹریفک رکتی ہی نہیں''۔

''بابو جی، تب سے بہت سارے لوگوں نے سڑک پار کر لی۔ آپ کو کس بات کا ڈر ہے''۔

''نہیں بھائی، گاڑیاں اتنی تیزی سے آ جا رہی ہیں کہ وہ مجھے بیچ سڑک پر کچل ڈالیں گی۔ کم سے کم انہیں سوچنا چاہیے کہ راہ گیروں کو سڑک پار کرنے کے لیے تھوڑی دیر رُک جائیں۔ کسی کو ہم لوگوں کی فکر ہی نہیں۔ ہمارے شہر میں ایسا نہیں ہوتا بھائی۔ اتنی بھیڑ......اتنی تیز رفتاری......وہاں نہیں ہوتی۔ وہاں اگر کوئی بوڑھا یا اپاہج سڑک پار کر رہا ہو دوسرے لوگ اُس کی مدد کے لیے سامنے آتے ہیں۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے راستہ پار کرواتے ہیں۔ میں نے خود کئی بار ایسا کیا ہے''۔

اس کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہاں پر لوگوں کو اس کی حالت کا اندازہ کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ یکبارگی اس کو اپنے خیالات پر ہنسی آ گئی اور وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔ ''میں کس شہر کی بات کر رہا ہوں۔ کس شہر کو اپنا کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ شہر میرا ہوتا تو میں یہاں کیوں بھٹکتا پھرتا''۔

''بابو جی، لو پانی پی لو۔ گھبراؤ نہیں۔ اس کی قیمت چکانے کی ضرورت نہیں ہے''۔ پانی بیچنے والے نے ٹھنڈا پانی کا گلاس پیش کیا اور پھر گویا ہوا''۔

''آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔ آپ کس دیش کے باسی ہیں؟''

اس نے پانی کا گلاس غٹا غٹ پی لیا اور پانی بیچنے والے سے درخواست کی کہ اس کی تولیا کو بھی گیلا کردے۔ پھر بول اُٹھا۔

''دیش......! ارے بھئی میں بھی اسی دیش کا رہنے والا ہوں''۔

یہ کہہ کر اس کے منہ پر جیسے تالے پڑ گئے۔ وہ آگے کچھ بول بھی نہ پایا۔ کچھ وقفے کے بعد وہ اپنے ہی من میں سوچنے لگا ''اس دیش کا باسی؟ کیسے؟ میں اس دیش کا باسی کیسے ہوں؟ اپنے ہی دیش میں کوئی رفیو.جی بن کر جیتا ہے کیا؟''

''بابو.جی، لگتا ہے آپ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر رُک سے گئے''۔

''بھائی صاحب، کیا کہوں۔ اب کہنے کے لیے رہا ہی کیا۔ میں اپنے ہی ملک میں رفیو.جی بن کر رہ گیا ہوں''۔

''بابو.جی۔ اس وقت ٹریفک بہت کم ہو چکی ہے۔ آپ جلدی سے سڑک پار کر لیجیے''۔

اس نے سڑک پر طائرانہ نظر ڈال دی۔ سڑک سچ مچ خالی ہو چکی تھی۔ دفتروں میں لنچ کا ٹائم ہو چکا تھا۔ بسوں اور لاریوں کی آمد و رفت گھٹ چکی تھی۔ یقیناً ٹریفک بہت کم ہو چکی تھی۔

اس نے ہمت جٹا کر آگے قدم بڑھایا۔ پیچھے مڑ کر پانی بیچنے والے کو دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھائے۔ ایک ......دو......تین......چار...... پانچ...... چھ......سات ......آٹھ......نو......دس......اب وہ سڑک کی دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ وہ رُکا اور اپنی گیلی تولیا سے اپنے پسینے سے شرابور چہرے کو پونچھنے لگا۔ اسکے بدن اور چہرے سے آگ نکل رہی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دھندلکا سا چھا گیا اور وہ دھڑام سے فٹ پاتھ پر گر پڑا۔

پانی بیچنے والے نے اس کو گرتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ پانی کی ایک بوتل لے کر دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچا۔ تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کی باچھوں سے سفید جھاگ نمودار ہو چکا تھا۔

اتنی دیر میں پولیس کی گشتی پارٹی آ پہنچی اور انہوں نے سرسام کی واردات کا ایک اور کیس درج کر لیا۔

●□●

# اداس لمحوں کا کرب

جن دنوں وہ یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لیے بطور وزیٹنگ پروفیسر آئی تھی، سارے ملک میں شاہ بانو کیس کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ فربہ بدن، گوری رنگت، آنکھوں پر بڑا سا چشمہ اور ہلکے بادامی رنگ کی ساڑی میں ملبوس مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی وہ ہندوستانی سیاست میں سیکولر روایتوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی۔ لیکچر کے دوران اس نے کئی بار جنگ آزادی میں اپنے والد مرحوم کی قربانیوں کا ذکر کیا جس کا معاوضہ وہ آج تک ملک سے وصول کر رہی تھی۔ وہی کیا، اس ملک میں ایسے کئی خاندان ہیں جو اپنے باپ دادا کی قربانیوں کا معاوضہ اب دیش سے وصول کر رہے ہیں۔ ایوانوں کی نشستیں حاصل کر کے یا پھر ترقیاتی بورڈوں میں نامزد ہو کر۔ اپنی سیٹ مخصوص کرنے کے لیے اس نے بھی سرکارِ وقت کے ساتھ اپنی وراثت کا سودا کیا تھا۔ بات اس وقت کی ہے جب اس کے والد ماجد کی غیر شائع شدہ کتاب ان کی وصیت کے مطابق منظر عام پر آنے والی تھی۔ سرکار کو یہ خدشہ تھا کہ اس پٹاری سے کہیں کوئی سانپ یا بچھو برآمد نہ ہو جو ان کو ڈس لے۔ اس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ شائع ہونے سے پہلے کتاب کی نظر ثانی کی جائے اور دل خراش مواد خارج کیا جائے۔ بدلے میں اس کو حکومت نے اپنی عنایتوں سے مالا مال کر دیا۔ جب سے وہ حکمراں پارٹی کے حق میں تو تا بولو گنگا رام کی رٹ لگائے ہوئے ہے تا کہ اس کی کرسی برقرار رہے۔

لیکچر ختم ہوتے ہی طرح طرح کے سوالات اٹھائے گئے۔ موضوعات تھے۔ آزادی کے لڑائی میں مسلمانوں کا حصہ، بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی، اردو کا مستقبل اور آزادیٔ نسواں۔ نادرہ بیگم بڑے ہی اطمینان سے ہر سوال کا جواب دیتی رہی اور ہر جواب میں کہیں نہ کہیں اپنے والد مرحوم کی قربانیوں کا ذکر کرنا نہیں بھولتی تھی۔

آخر کار میں بھی کھڑا ہوا اور اپنے ترکش سے تیر نکال کر سیدھے وار کیا۔ ''محترمہ، مطلقہ

مسلمان عورتوں کے نان ونفقہ کے مسئلے پر آپ کی کیا رائے ہے؟ سپریم کورٹ نے تو حال ہی میں ان کے حق میں فیصلہ سنایا ہے۔"

وہ تلملا اٹھی مگر جلدی ہی فنکارانہ انداز میں پہلو بدل لیا اور پھر اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی بسلیری کی بوتل سے گلاس میں پانی انڈیل دیا اور بے صوت وصدا اسے اپنے گلے سے نیچے اتار لیا۔ اس کے بعد اس نے میرے سوال کا جواب دیا۔

"یہ تو شریعت کے خلاف ہے۔ ہمارے صحیفوں میں ہر مسئلے کا حل بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر درج ہے۔ اسلام میں مہر دینے کی روایت ہے جس کی رو سے نکاح سے پہلے ہر مرد اپنی ہونے والی بیوی کو طے شدہ رقم دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس رقم پر اس عورت کے بغیر کسی اور کا حق نہیں بنتا۔ دراصل یہی رقم مطلقہ کی آیندہ زندگی کی ضمانت ہوتی ہے۔"

"محترمہ، اتنا تو خیر میں بھی جانتا ہوں۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس گرانی کے دور میں اس معمولی سی رقم سے پہاڑ جیسی زندگی اور پھر بال بچوں کا بوجھ اٹھایا جاسکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ یہ رقم ہوتی کس لیے ہے۔ اس رقم سے طلاق شدہ عورت قناعت کر کے اپنی اور اپنے بال بچوں کی دیکھ بھال کر سکتی ہے۔"

"مجھے آپ کی اس بات سے قطعی اتفاق نہیں۔ یہ رقم اتنی قلیل ہوتی ہے کہ ایک عورت بال بچوں کا کیا اپنا پیٹ بھی زیادہ دیر نہیں پال سکتی"۔

"آپ کی انفارمیشن غلط ہے۔ یہ سب غلط فہمیاں چند مفاد پرست سیاسی رہنماؤں اور ذرائع ابلاغ کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ آپ میری ہی مثال لیجیے۔ جب میری شادی ہوئی تھی میرے ہونے والے شوہر نے ایک بنگلہ اور ایک کار دینے کا وعدہ کیا۔ شادی ہوتے ہی انہوں نے میرے نام اپنا فارم ہاؤس لکھ دیا اور پھر ایک نئی کار خرید کر میرے حوالے کر دی۔ اب آپ ہی بتایئے اس کے علاوہ وہ کیا دے سکتے تھے۔ خدانخواستہ اگر مجھے ضرورت پڑے گی تو کیا اتنی ساری رقم میرے لیے کافی نہیں۔"

جواب سن کر مجھے اپنی حماقت پر ہنسی آگئی۔ مجھے فرانسیسی انقلاب کی میری انٹونیٹ کے وہ مشہور الفاظ یاد آ گئے جو اس نے کسی وزیر کے سوال کے جواب میں کہے تھے۔ جب اسے پوچھا

گیا کہ وہ ان ہزاروں لاکھوں لوگوں کو کیا مشورہ دے گی جو محض ایک روٹی کی خاطر گھنٹوں قطاروں میں کھڑے رہتے ہیں۔اس نے صرف اتنا کہا۔"انہیں اگر روٹی نہیں ملتی ہے تو کیک کھانا چاہیے"۔

بلوریں ایوانوں میں پلی بڑھی یہ عورت، دون اسکول سے تعلیم یافتہ۔اس نے کبھی دھرتی پر پاؤں رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔وہ میرے سوال کی گہرائی اور گیرائی کیا سمجھ لیتی۔میں اسے کیسے سمجھاتا کہ اس برصغیر میں ہر مسلمان عورت کو بنگلہ اور کار مہر میں نہیں ملتے۔میرے سامنے حمیدہ کی زندگی تھی۔اس نیک نہاد کا المناک انجام تھا۔

جس محلے میں ہم رہتے تھے وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ہندوؤں کے بس دس گیارہ گھر تھے اور وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ سٹے ہوئے۔کبھی ایسا محسوس ہی نہیں ہوا کہ ہم دو فرقے ہیں اور ہمارے رسم ورواج الگ الگ ہیں۔دونوں فرقے ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک رہتے۔مسلمان لڑکی کی شادی ہوتی تو ہندو استقبال، سجاوٹ اور دیگر کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔اور ہندو لڑکی کی شادی ہوتی تو مسلمان ہمسایہ کے گھر میں برات ٹھہرائی جاتی، اس کی بالائی منزل کے بڑے ہال میں دعوت کا انتظام کیا جاتا۔مہینوں پہلے شادی کی تیاریاں شروع ہوتیں۔ہندو اور مسلمان عورتیں مل بیٹھ کر چھاج سے چاول پچھوڑتیں اور بعد میں رہی سہی بھوسی ہاتھوں سے نکال لیتیں۔لال مرچوں کے بیج نکالنے اور انہیں اُکھل میں کوٹنے کا سماں ہی کچھ عجیب سا ہوتا۔ہر طرف سے مسلسل چھینکوں کی آوازیں آتیں اور ہر چشم سے آنسو رواں ہوتے۔

حمیدہ کی شادی پر بھی یہی سب کچھ ہوا۔رات گئے برات آگئی۔برات کے ساتھ ایک ہجوم اُمڈ آیا۔محلے کے سبھی بچے، بوڑھے اور جوان دلہا میاں کو دیکھنے گلیوں میں نکل آئے۔اور ان میں سے بہت سارے لوگ برات کے ساتھ چلتے رہے۔دلہا میاں ماشاء اللہ گبرو جوان تھا۔پیچھے پیچھے بینڈ باجے پر فلمی دھنیں بج رہی تھیں۔کئی مشعلچی اپنے کاندھوں پر پیٹرومیکس اٹھائے تاریک گلیوں کو روشن کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔شریر بچے ننگے پیر گھوڑی کے ساتھ ساتھ دوڑے چلے جا رہے تھے تاکہ دلہے کی نظر اتارنے کے لیے اس پر پھینکی گئی شیرینی اور سکے اٹھا کر اپنی جیبوں میں ٹھونس لیں۔عجیب سماں تھا۔گلیوں کے مہیب اندھیرے، ان کو چیرتے ہوئے بیمار اجالے۔

براتیوں کے فتحمند چہرے اور قرض کے بوجھ سے مرجھائے لڑکی والے۔

ادھر میزبان کے گھر میں بھی دھوم مچی تھی۔ عورتیں گلا پھاڑ پھاڑ کر استقبالیہ گانے گا رہی تھیں۔ کوئی دلہے راجہ کو 'غازی' کا لقب دیتا تھا اور کوئی 'مجاہد' کا خطاب۔ حمیدہ کی سہیلیاں اس کو گھیرے ہوئے مسلسل تنگ کیے جا رہی تھیں۔ اس کو سہاگ رات کے ہیبت ناک قصے سنا کر ڈرا رہی تھیں۔ اور بار بار اس کے بناؤ سنگھار کو درست کر رہی تھیں۔

حمیدہ نیک طینت اور حوصلہ مند لڑکی تھی۔ ہم دونوں کی عمر میں انیس بیس کا فرق تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں بارہ برس کا تھا اچانک میری ماں کا ہارٹ فیل ہوا تھا۔ پتا جی اپنے بہنوئی کو ہوائی اڈے پر چھوڑنے گئے تھے۔ گھر میں صرف میں اور میری بہنیں تھیں۔ ہم نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ آواز سنتے ہی حمیدہ اور اس کی ماں ساحرہ دوڑتی چلی آئیں۔ ساحرہ نے حالات کا جائزہ لیا اور حمیدہ سے مخاطب ہوئی۔ ''حمیدہ بیٹی، تم فوراً گھر سے چار پانچ تالے لے کر آؤ اور اوپر والے سبھی کمروں کو بند کر دو۔ ان معصوموں کو کیا معلوم کہ مرگ مفاجات کیا ہوتا ہے۔ بے چارے لٹ جائیں گے۔''

حمیدہ نے ویسا ہی کیا جیسے اس کی ماں نے ہدایت دی۔ بس نچلی منزل کے دو کمرے کھلے رہے جہاں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ تیرہویں دن تک حمیدہ میری بہنوں کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ اس کے پانچ سال بعد میری بڑی بہن کی شادی طے ہوئی۔ حمیدہ لگاتار ایک مہینے ہمارے گھر آتی رہی۔ دیگر عورتوں کے ساتھ چاول صاف کیے، انہیں قرینے سے مٹی کے بھانڈوں میں رکھ دیا۔ میری بہنوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر سارے مکان کی صفائی کی۔ لوگ اس کی ہمت اور پھرتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔

اب یہ اس کی اپنی شادی تھی۔ حمیدہ ڈولی میں بیٹھ کر سسرال چلی گئی۔ مگر پانچ برسوں میں ہی دو بیٹیوں کو گود میں اٹھائے واپس اپنے میکے چلی آئی۔ بے چاری کی قسمت پھوٹی تھی جو اپنے خالہ زاد بھائی ایوب سے شادی کر لی۔ لڑکا کولکتہ میں کسی قالین کے تاجر کے ہاں سیلز مین کا کام کرتا تھا۔ سال میں صرف ایک بار دس پندرہ روز کے لیے گھر آ جاتا۔ ہر تین ماہ کے بعد اپنی بیوی کے نام پانچ سو کا منی آرڈر بھیج دیتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے کولکتہ میں کسی بنگالن سے شادی کر لی ہے۔ ایسی صورت میں میکے واپس آنے کے سوا حمیدہ کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بے

چاری تعلیم یافتہ تو تھی نہیں البتہ بچپن میں نمدہ سازی کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ وہ نمدوں پر خوبصورت کڑھائی کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتی تھی۔ بس اسی مزدوری سے اپنا اور اپنے دونوں بچوں کا پیٹ پالنے لگی۔

پہلے پہل ایوب طلاق دینے کے لیے راضی نہ ہوا۔ دیتا بھی کیوں! وہاں کولکتہ میں خدمت کرنے کے لیے مستقل باندی تھی اور یہاں زائقہ بدلنے کے لیے حمیدہ۔ بہر حال یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ نئی بیوی نے روپیہ بھیجنے پر روک لگا دی۔ انجام کار اسے طلاق دینا ہی پڑا۔ اور پھر حمیدہ کو ایک سو اکاون روپے بطور مہر موجل کے ادا کیے گئے۔ نم آنکھوں اور لرزتے ہاتھوں سے حمیدہ نے روپے لے لیے، اپنے سر سے ہرا ریشمی رومال اتارا، اور پھر اس کے ایک کونے میں ان روپیوں کو ایسے باندھا جیسے کوئی تبرک ہو۔ اس نے رومال کو ہمیشہ کے لیے اس کیل پر لٹکا دیا جس کے اوپر خانہ کعبہ کی تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اس رومال کو دیکھا کرتی اور اس کی آنکھوں سے برسات شروع ہو جاتی۔

حمیدہ کو میکے واپس آئے ہوئے صرف تین سال ہو چکے تھے۔ میں ان دنوں ایم اے پریویس کے امتحانات کی تیاری کر رہا تھا اور دیر رات تک جاگتا رہتا تھا۔ ایک رات درد بھرے نالوں نے مجھے چونکا دیا۔ میرے اور حمیدہ کے مکان کے درمیان صرف دس فٹ گلی کا فاصلہ تھا۔ اس کے کراہنے کی آوازیں بلند سے بلند تر ہو رہی تھیں۔ وہ زور زور سے آہ و فغاں کر رہی تھی۔

''اے خدا، میں نے تیرا کیا بگاڑا جو تم مجھ پر اتنے ستم ڈھا رہا ہے''۔

''ارے مر گئی...... مجھے کوئی تو آکر بچا لو۔''

''کیا اس دنیا میں کوئی نہیں جو مجھے بچا سکتا ہے۔ ہائے خدایا، تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا۔''

''اگر مرنا ہی قسمت میں لکھا ہے تو اٹھاتا کیوں نہیں۔ اتنی اذیتیں کیوں دے رہا ہے۔''

دوسری صبح میں نے اپنی چھوٹی بہن کو حمیدہ کے گھر بھیج دیا تا کہ معلوم کر لے آخر ماجرا کیا ہے۔ کچھ وقفے کے بعد وہ روتی بسورتی واپس آئی۔ اس کے منہ سے کوئی بات ہی نکل نہیں رہی تھی۔ اس کے گلے میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ میں نے اٹھ کر اسے پانی کا گلاس تھما دیا۔ آخر کار اپنے آپ کو سنبھال کر وہ بولی۔

''بھیا۔ڈاکٹر نے کہا ہے کہ حمیدہ کو کینسر ہے۔وہ ایک دو مہینے سے زیادہ نہیں بچ پائے گی۔کینسر ایڈوانسڈ اسٹیج میں ہے۔''

''ایڈوانسڈ اسٹیج کا کینسر! کیوں مرض کی تشخیص پہلے نہیں ہوئی تھی کیا؟''

''مرض کے بارے میں تو انہیں پہلے ہی سے علم تھا مگر کرتے بھی کیا۔مالی مشکلات نے پریشان کرر کھا ہے۔ڈاکٹر نے پونا کے ٹاٹا کینسر اسپتال میں معائنہ کروانے کا مشورہ دیا تھا مگر ان کے پاس اتنی رقم کہاں سے آتی۔''میری بہن نے ساری معلومات فراہم کیں۔

تقریباً دو مہینے حمیدہ اس جان لیوا مرض سے جوجھتی رہی۔رات بھر وہ چلاتی رہتی اور بار بار خدا سے شکوے شکایت کرتی۔ادھر میں اپنے کمرے میں ماہی بے آب کی مانند تڑپتا رہا۔سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسی شریف النفس لڑکی پر یہ قہر کیوں ٹوٹ پڑا۔وہ بے چاری ہر لمحے موت کی آہٹ سننے کے لیے کان دھرے بیٹھی رہتی اور میں۔میں اس کی زندگی کے لیے نہیں بلکہ اس کی موت کے لیے ہردم بھگوان سے پرارتھنا کرتا۔

آخر کار اوپر والے نے ہم دونوں کی فریاد سن لی۔عین معراج النبیؐ کے روز اس کی روح قفس سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوگئی۔گھر ہی کیا سارے محلے میں کہرام مچ گیا۔

پھر چند روز ہی میں حمیدہ میری بیتی یادوں کا حصہ بن کر رہ گئی۔اس کا ریشمی رومال، جس میں اس کا مہر بندھا ہوا تھا، اس کی وفات کے بعد بھی کئی سال اُس کیل پر لٹکتا رہ گیا۔

●□●

# مغرور لڑکی

''جوانی میں قوت اور بڑھاپے میں پیسہ ہو تو زندگی آرام سے گزر جاتی ہے''۔ میں نے اولڈ مونک کا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر اپنی رائے ظاہر کی۔

بار میں ہم چار افسر اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے رم پی رہے تھے۔ کاؤنٹر کی دوسری طرف بارمین بوتلیں اور گلاس صاف کر کے قرینے سے سجا رہا تھا۔ ہمارے سامنے آلو چپس اور فرائیڈ مونگ پھلی کی پلیٹیں پڑی ہوئی تھیں جنہیں ہم وقتاً فوقتاً منہ میں ڈالے جا رہے تھے۔

فوجی میس میں 'عورت' اور 'سیاست' کو بحث کا موضوع بنانا سخت منع ہے لیکن میس میں ہم چار دوستوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ کہیں کسی سینئر افسر کی پرچھائی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر کس کا ڈر تھا۔ محفل میں شراب کے دور چل رہے ہوں اور آدمی شباب کی باتیں نہ کرے۔ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ ہم سب گھر کی بندشوں اور آفس کے تفرقوں سے دور اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ وہاں بریلی میں یونٹ کی مصروفیات، گھر گرہستی کے جھمیلوں اور بال بچوں کی پڑھائی سے فراغت ہی نہیں ملتی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ شمالی سرحد کی ریکی کے لیے چاروں افسروں کو عارضی ڈیوٹی پر المموڑا بھیج دیا گیا تھا۔ یہاں تو خیر فرصت ہی فرصت تھی۔

میس کی عالیشان سحر انگیز عمارت سفید برفانی چوٹیوں کے پس منظر میں خوش نما اور دلکش لگ رہی تھی۔ اونچی اونچی گنبد نما چھتیں، چوبی نقش دار محرابی کھڑکیاں، چھتوں سے لٹکتے ہوئے بلوریں جھاڑ فانوس، شیشم کی چمچماتی میز کرسیاں اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی دوسری جنگ عظیم کی پینٹنگز یورپی مذاق کی چھوڑی ہوئی نشانیاں تھیں۔ بجلی کے قمقموں سے پورا میس جگمگا رہا تھا جبکہ باہر وا ! ہا رات کی ٹھنڈی چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ دور پہاڑی ڈھلوانوں پر اکثر و بیشتر مکانوں سے پیلے اجالے چھن چھن کر باہر آ رہے تھے اور آسمان پر دھندلے ستاروں سے ہم سری کرنے

کی کوشش کر رہے تھے۔ ٹھنڈی برفیلی ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئیں کھڑکیوں سے یوں ٹکرا رہی تھیں جیسے اندر آنے کے لیے دستک دے رہی ہوں۔ میس کا درجہ حرارت برقرار رکھنے کے لیے آتش دانوں میں الاؤ جل رہے تھے۔ ایسے ماحول میں مخمور و سرشار ہونا فطری عمل تھا۔

''تمہاری بات سے میں اتفاق نہیں کرتا۔ آج کل کی دنیا میں صرف پیسہ بولتا ہے۔ زر کے بغیر نہ زمین حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی زن۔'' کیپٹن اگروال نے فیصلہ کن الفاظ میں کہا۔

''میں بھی اگروال کی تائید کرتا ہوں۔ خالی خولی قوت کس کام کی۔ عورت کا پیٹ بھی تو بھرنا چاہیے،'' کیپٹن جموال نے مونگ پھلی کے دو چار دانے منھ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ جوانی اور قوت ہو تو عورت کی تسخیر مشکل نہیں، چاہے آدمی غریب ہی کیوں نہ ہو''۔ میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

''لگتا ہے ہندی فلموں کا کافی اثر پڑ چکا ہے۔ حقیقی زندگی میں رئیس زادیاں ڈرائیوروں اور قلیوں کے ساتھ نہیں بھاگتیں۔'' کیپٹن جموال نے میری تردید کی۔

کیپٹن سیکھوں کے پینے کی رفتار قدرے تیز تھی۔ بڑا دل پھینک قسم کا آدمی تھا۔ لڑکی کے ایک اشارے پر جیب خالی کر دیتا تھا۔ 'کل' نام کا کوئی لفظ اس کی لغت میں نہ تھا۔ ہماری گفتگو سے اس کو مزہ نہیں آ رہا تھا اس لیے بگڑ کر بولا۔ ''یار کاہے کو فضول دی بحث لگا رکھی ہے۔ کوئی ڈھیو گل کرو۔ سنا ہے بریلی میں نرسنگ آفیسرس میس میں آج کل ایک سونی کڑی آئی ہے۔ بڑی نخرے باز ہے۔''

''لو سنو، سیکھوں کی بات! کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ابے یار تم سرداروں کو ہر عورت شہوت انگیز لگتی ہے۔ پھر اس کی تو بات ہی نہیں۔'' اگروال نے اس کی ٹانگ کھینچی۔

''سیکھوں ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے بھی اس کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔'' جموال نے تائید کی۔

''سیکھوں! جا کر مل کیوں نہیں آتے۔ اس کا نام کامنی ہے۔ تین سو چھ کمرے میں رہتی ہے۔'' اگروال نے یہ خبر ایسے سنائی جیسے دور کی کوڑی لے کر آیا ہو۔

کامنی کا نام سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے مگر میں نے اپنے آپ پر ضبط کرنا ہی مناسب سمجھا اور شراب کے تلخ گھونٹ حلق سے اتارتا رہا۔

''بہت ہی مغرور قسم کی لڑکی ہے۔ پُٹھے پر ہاتھ بھی رکھنے نہیں دیتی۔ بس 'ہوں ہاں' کر کے جواب دیتی ہے۔'' جموال نے رازدرانہ لہجے میں مزید جانکاری فراہم کی۔

''پُٹھّے پر ہاتھ......! کیا خوب کہی۔ پہلے اسے بات کرنے کی ہمت تو جٹالے یار۔ پھر پُٹھّے کی سوچ۔ بہت کڑک ہے۔ کاٹ کھائے گی۔ میں تو اس سے مل بھی چکا ہوں۔ چیز ہے چیز! اس کو ملنے کے لئے موٹر گاڑیوں پر سوار کرنل اور میجر آتے ہیں مگر وہ کسی کو گھاس بھی نہیں ڈالتی۔'' اگروال نے حال ہی میں بیماری کا بہانہ بنا کر کئی روز اسپتال میں کاٹے تھے۔ اتفاقاً اسی وارڈ میں کامنی کی ڈیوٹی تھی۔

''کیسی لگتی ہے، اگروال؟ ہائے میرا دل تو ابھی سے دھک دھک کرنے لگا ہے۔'' سیکھوں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بیہوشی کی اداکاری کی۔

''بڑی سیکسی ہے یار، گدرایا ہوا بدن، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹ، مرمریں بانہیں اور اس پر بوائز کٹ۔ یار اس کو تو فلموں میں ہونا چاہیے تھا۔ کیا اس نرسنگ پروفیشن میں چلی آئی۔'' اگروال نے اس کے دماغ کی خالی جگہوں کو پر کیا اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''کچھ کوشش ووشش کی یا نہیں؟'' سیکھوں پوچھ بیٹھا۔

''کوشش تو بہت کی یار۔ کئی تحفے خرید کر لائے مگر دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ پورے دس دن یوں ہی چلے گئے۔'' اگروال نے اعتراف کیا۔

مجھے ان باتوں پر ہنسی بھی آرہی تھی اور ترس بھی۔ یہ فوجی افسر تو عورت کو بھی پلٹن کا سپاہی سمجھ لیتے ہیں۔ ادھر منہ سے حکم نکلا نہیں، ادھر تعمیل ہونی چاہیے۔ عورت کے معاملے میں ان کے وِچار بھی الگ ہوتے ہیں۔ مدتوں گھر سے دور سرحدوں پر رہنے کے سبب وہ عورت کی پرستش کرتے ہیں اور اس کو خدا کی دی ہوئی سب سے انمول چیز سمجھتے ہیں۔ تھوڑا سا بھی پیار ملے، اس پر محبتوں کی بارش کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو روک لینا اب میرے بس کی بات نہیں تھی۔ دل اور دماغ کے بیچ جنگ چھڑ گئی۔ عقل کہتی تھی کہ لب سی لو اور جنوں کہتا تھا کہ سب کچھ کہہ ڈالو۔ آخر کار مجھ سے رہا نہ گیا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ جس اچھوتی لڑکی کی تم اتنی تعریف کر رہے ہو وہ اکثر ڈیوٹی ختم کر کے سائیکل رکشے پر سوار ہو کر میرے پاس چلی آتی ہے تو کیا تم یقین کرو گے؟''،

قریب تھا کہ سیکھوں کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر جاتا میں نے اسے سنبھالا۔

''سنبھل کے بھائی۔ ابھی تو میں نے کچھ کہا ہی نہیں......'' میں نے سیکھوں کی جانب مڑ کر کہا۔

''اوہ کم آن کیپٹن سہراوت۔ تم اور تمہارے شگوفے!'' اگروال نے بیچ میں ٹوکا۔ اس کو احساس ہوا کہ چند انکشافات کی بدولت جو اہمیت اس نے پائی تھی وہ کہیں زائل نہ ہو جائے۔

''چھوڑتے جاؤ۔ چھوڑتے جاؤ۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے پاس لپیٹنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔'' جموال نے بھی میرا مذاق اڑایا۔

''بھئی، کچھ ایسی بات کہو جو ہضم ہو سکے۔ کبھی عورت دیکھی بھی ہے؟ ایسے کہہ رہے ہو جیسے بہت بڑے تیرانداز ہو۔ اٹھ کر پہلے اپنا منہ آئینے میں دیکھ لو۔''

ہڑبڑاہٹ میں اگروال نے سارا گلاس ایک ہی گھونٹ میں پی لیا اور بار مین کو دوسرا پیگ بنانے کا آرڈر بھی دے دیا۔

ان تینوں نے میرے دعوے کو اس لیے مسترد کر دیا کیونکہ نہ تو میں شکل وصورت سے وجیہہ اور خوبصورت ہوں اور نہ ہی چلتا پرزہ۔ پھر میرے پاس نہ موٹر سائیکل ہے اور نہ کار۔ سائیکل پر دفتر جاتا ہوں اور سائیکل پر ہی واپس آتا ہوں۔ اپنے بیان کی سچائی ثابت کرنے کے لیے میں ان سے مخاطب ہوا۔

''یار کہو تو پوری کہانی سنا دوں ورنہ جو مرضی سوچتے رہو۔''

''سناؤ، جو سنانا ہے۔'' اگروال بولا۔

''ہاں بھائی، سناؤ تُسی۔'' سیکھوں نے تائید کی۔

''چلو بھئی، شروع ہو جاؤ'' جموال بھی ہمنوا ہوا۔ اور پھر تینوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''تم لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ میں پچھلے سال بریلی ٹرانسفر ہو کر آیا۔ تم لوگ تو مجھ سے پہلے ہی آ چکے تھے۔ فیملی کوارٹر نہ ملنے کی وجہ سے دو تین مہینے میس ہی میں گزارا کرنا پڑا۔ وہاں میرا روم پارٹنر لیفٹیننٹ آہلووالیہ تھا۔ بڑا ہی خوش خلق اور ملنسار بندہ تھا۔ ان دنوں کامنی اسی کے وارڈ میں کام کر رہی تھی۔ ایک سنڈے کو ہم اپنی سائیکلوں پر سوار تفریح کے لیے بازار میں گھوم رہے

تھے۔ ہمارے آگے آگے ایک رکشے پر دو خوبصورت دوشیزائیں جارہی تھیں۔ اچانک ہماری نظریں ان پر پڑیں۔ وہ دونوں ہمیں بار بار دیکھ رہی تھیں۔ جونہی ہماری سائیکلیں ان کے قریب پہنچیں دونوں نے اپنا سر ہلا کر آہلووالیہ کو سلام کیا۔ میں نے جب ان کی جانب دیکھا تو ان میں سے ایک لڑکی کو اپنی طرف متوجہ پایا۔ اس وقت میں مسکراہٹ بکھیرنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

دوسرے روز اس لڑکی نے آہلووالیہ سے میرے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ جواب میں آہلووالیہ نے میرے بارے میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو اسے معلوم تھا۔

اس روز کے بعد کئی بار ہمارا آمنا سامنا ہوا مگر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی بات نہ ہو پائی۔ جانتے ہو وہ لڑکی کون تھی؟ وہ کامنی تھی۔

کبھی کبھی آفس سے لوٹ کر آہلووالیہ سے کامنی کے بارے میں میری گفتگو ہوتی۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی میرے بارے میں پوچھتی رہتی ہے۔ دل میں عجیب سا اضطراب پیدا ہوا۔ میں اس سے ملنے کی سبیلیں کرتا رہا مگر ناکام رہا۔

کچھ مدت کے بعد مجھے فیملی کوارٹر الاٹ ہوا اور یہ سلسلہ بھی منقطع ہوا۔ اب آہلووالیہ سے نہ تو ملاقات ہوئی اور نہ بات چیت۔

ادھر دوسری طرف بھی آگ برابر کی لگی ہوئی تھی۔ ایک روز آفس میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''کون......؟'' میں نے رسیور کان سے لگاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہیلو سر۔ میں سائیکو وارڈ سے کیپٹن کامنی بول رہی ہوں۔ آپ کیپٹن سہراوت ہیں ناں۔''

''جی ہاں میں کیپٹن سہراوت بول رہا ہوں'' کامنی کی آواز سن کر میری ہوائیاں اڑ گئیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آگے کیا بولوں۔

''سر۔ پرابلم یہ ہے کہ ہمارے وارڈ میں آپ کے یونٹ کا ایک مریض داخل ہے۔ اس کے پیپرس نامکمل ہیں۔ مجھے ان کے پیپرس مکمل کرنے کے لیے کچھ انفارمیشن چاہیے۔''

''کیوں نہیں۔ میں اپنے صوبیدار سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ ساری انفارمیشن دیں گے۔ آپ اس سے براہ راست بات کرلیں۔ میں اس کو ابھی بلاتا ہوں۔''

''سر، پھر رہنے دیجیے۔ میں آفس سے چٹھی لکھوا کر آفیشلی منگوا دونگی۔ دراصل مجھے آپ سے ایک اور پرسنل کام ہے''۔

''ہاں فرمائیے۔''میں نے وضاحت چاہی۔

''سر آپ کے ہاں خوبصورت ڈاک ٹکٹیں ایشو ہوتی ہیں۔ مجھے بچپن ہی سے فلیٹلی کا شوق رہا ہے۔ جہاں کہیں بھی ٹکٹیں مل جاتی ہیں، جمع کر لیتی ہوں۔ کیا آپ نئے ایشوز دلوا سکتے ہیں؟''

''دیٹ از گریٹ۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ فلیٹلی کلب کے ممبر بن جایئے۔ آپ کو بھی نئے ایشوز گھر بیٹھے ہی مل جایا کریں گے۔ صرف ایک فارم اور ممبر شپ فیس بھرنا پڑیں گے۔''

''کسی کے ہاتھ بھجوا دیجیے۔'' کامنی نے درخواست کی۔

''ٹھیک ہے......'' ذرا رک کر میں پھر گویا ہوا۔ ''نہیں تو ایسا کر لیں۔ آج آفس کے بعد میں آپ کے وارڈ سے ہوتا ہوا جاؤں گا۔ آپ کو فارم بھی دوں گا اور چند خوبصورت ٹکٹیں بھی۔''

''شکریہ سر، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔''

دن کے دو بجے فارم اور چند پرانی نادر ٹکٹیں لے کر میں کامنی کے وارڈ میں پہنچ گیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے کینٹین سے چائے منگوالی۔ پھر باتوں باتوں میں شام کو پکچر دیکھنے کا پروگرام بھی بن گیا۔

حسب وعدہ میں سنیما ہال کے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ سائیکل رکشا پر چلی آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق سی چھا گئی۔ فلم دیکھ کر ہم دونوں ڈنر کے لیے پاس ہی ریجنسی ریستوراں میں چلے گئے اور پھر میری دعوت پر وہ میرے گھر چلی آئی۔ ان دنوں میں گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ بال بچے ابھی تک جے پور میں تھے۔ بچوں کے امتحانات کے سبب چار پانچ ماہ تک ان لوگوں کا آنا ممکن نہ تھا۔

کامنی بڑے اطمینان سے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے وائین کیبنٹ کھول کر اس کو وہسکی پیش کی جو اس نے کسی جھجک کے بغیر قبول کر لی۔ ویسے تو سنیما ہال کی تاریکی میں پہلے ہی سے ہم دونوں کے درمیان حجاب ٹوٹ گئے تھے تاہم وہ بڑے ہی تدبر سے کام لے رہی تھی۔ بہرحال دو تین پیگ چڑھانے کے بعد وہ بے تکلف ہوگئی اور دھیرے دھیرے ہمارے

بیچ کی ساری دوریاں مٹ گئیں۔ رات گیارہ بجے میں اسے میس میں چھوڑ آیا۔

اس کے بعد ہماری ملاقاتیں اکثر ہوا کرتی تھیں۔ وہ جب بھی ملتی اپنی بیتی ہوئی زندگی کے کسی نہ کسی گوشے سے روشناس کراتی۔ کامنی کر مجھ پر کافی بھروسہ ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دراصل ایک شادی شدہ عورت ہے۔ تین سال پہلے جب وہ لیفٹننٹ تھی، والدین نے اس کی شادی کالج کے ایک لکچرر سے کردی مگر اس کا خاوند خود لذّتی کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دیتا رہا۔ اکثر منہ پھلا کر بیٹھا رہتا۔ کامنی محض آرائش کا سامان بن کر جینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ شادی شدہ زندگی میں برابر کا شریک بن کر جینا چاہتی تھی۔ اپنے شوہر کا طور طریق اس کے لیے نفسیاتی شاک سے کچھ کم نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی سال میں طلاق ہو گیا۔

کامنی اس صدمے سے کبھی ابھر نہ پائی۔ وہ کھوئے ہوئے پیار کو دوسرے مردوں میں ڈھونڈنے لگی لیکن سبھی کا برتاؤ کاروباری قسم کا تھا۔ اسے تسکین ملی نہ تملیک۔ لہٰذا وہ مردوں سے نفرت کرنے لگی اور ابریشم کے کیڑے کی مانند اپنے گرد کویا بُننے لگی۔ وہ خود بھی اسی دلدل میں پھنس گئی جس میں کبھی اس کا طلاق شدہ خاوند پھنسا ہوا تھا۔ مرد کی عدم موجودگی میں وہ بھی خود لذّتی کا شکار ہو گئی۔

مجھ سے ملنے کے بعد اسے لگا گویا میں اس کی زندگی میں بہار بن کر آ گیا ہوں۔ وہ میرے ساتھ جتنی بھی دیر رہی خوش و خرم رہی۔ ہم دونوں میں ایک عجیب قسم کی اپنائیت پیدا ہو گئی تھی حالانکہ اسے معلوم تھا کہ یہ بہار بھی محض چندروزہ ہے۔ مجھے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ جب میری بیوی آئے گی تو بے چاری کامنی کا کیا ہوگا۔ وہ پھر اکیلی پڑ جائے گی۔ اسے اپنے کمرے میں پھر اسی پرانی گھٹن کا احساس ستائے گا۔ کمرے کی چاردیواری اسے کھانے کو دوڑے گی اور پھر وہ اس کمی کا نعم البدل ڈھونڈنے لگے گی۔

آخر کار وہ دن آ ہی گیا۔ میری بیوی اور بچے بریلی آ گئے اور ہماری ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔ حالانکہ ہم دونوں کے درمیان جو دل کا رشتہ قائم ہو چکا تھا وہ پھر بھی نہ ٹوٹا۔

اب میں تمہیں ایک ایسی بات بتاؤں گا جس سے تم چونک جاؤ گے۔ دس روز پہلے کامنی نے پھر سے شادی کر لی ہے۔ اس کے پاس کئی پروپوزل آئے تھے جن میں سے اس نے صرف تین لڑکوں کو چن لیا تھا۔ شادی طے کرنے سے پہلے وہ مجھ سے ملنے میرے آفس آئی اور تینوں

لڑکوں کے بائیوڈاٹا سامنے رکھ دیے تھے۔اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے لیے مناسب بَر چن لوں۔ میں نے اس کی خاطر کینیڈا میں مقیم ایک مونا سکھ چن لیا۔وہ حیران تھی کہ میں نے سکھ لڑکے کو کیوں چن لیا۔اس کی وجہ پوچھنے بیٹھی۔ جواباً میں نے کہا کہ سکھ لوگ بڑے جیالے اور فرماں بردار ہوتے ہیں۔اپنی بیوی کی مانگوں کو پورا کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔علاوہ ازیں لڑکا کینیڈا میں رہتا ہے۔اس لیے روشن ذہن اور ترقی پسند بھی ہوگا۔کامنی کے چہرے پر شرارت بھری مسکان پھیل گئی اور پھر وہ ہاتھ ملا کر چلی گئی۔

شادی کے باعث کامنی نے فوج کی نوکری چھوڑنے کی درخواست دی ہے اور اب کینیڈا جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔

ابھی کہانی ختم بھی نہ ہوئی تھی میس حوالدار ہمارے روبرو کھڑا ہو گیا۔'' جے ہند شریمان! ڈنر لگ چکا ہے۔'' اور ہم سب ڈنر کے لیے ڈائننگ ہال کے اندر چلے گئے۔

●□●

دیپک بدکی

1

# شیر اور بکرا

دراصل اس کا نام فاطمہ تھا مگر لوگ اس کو 'فاطی' کے نام سے جانتے تھے۔ اسی طرح اس کے خاوند کا نام اسماعیل تھا جس کا مخفف 'اسمال' ہر ایک کی زبان پر چڑھ گیا تھا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ انہیں خود بھی اپنا اصلی نام یاد نہیں تھا لوگوں کی تو بات ہی نہیں۔

شوہر اور بیوی دو مختلف فرقوں سے وابستہ تھے۔ اسمال 'شیر' فرقے سے تعلق رکھتا تھا جبکہ فاطی کا خاندان 'بکرا' فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ شیر بکرے کی یہ تفریق دو قوی اناؤں کے ٹکرانے کی عجیب داستان ہے۔ ۱۹۳۱ء سے پہلے دونوں جہلم کے ایک ہی گھاٹ پر پانی پیا کرتے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مولوی یوسف شاہ کو محسوس ہوا کہ نوخیز شیخ محمد عبداللہ اس کی مقبولیت میں سیندھ لگا رہا ہے۔ اتنے کم عرصے ہی میں لوگوں نے شیخ صاحب کو شیر کشمیر کے خطاب سے نوازا تھا۔ ہزاروں لوگ شدید سردی اور منفی درجہ حرارت کے باوجود اپنے محبوب راہنما کی سحر انگیز تقریر سننے کے لیے میلوں کی مسافتیں طے کر کے آتے۔ یہی وجہ تھی کہ مولوی صاحب کے دل میں خدشات نے جنم لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شرر شعلہ بن گیا۔ دونوں کے راستے الگ ہوئے اور وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے۔ باریش مولوی کے معتقد 'بکرے' کہلانے لگے جبکہ شیر کشمیر کے پیروکار 'شیر' کہلانے لگے۔ شیخ صاحب نے جامع مسجد کو الوداع کہہ کر مجاہد منزل میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد کھڑی کر دی۔

سرحدیں کھنچ گئیں اور ان سرحدوں پر آئے دن تناؤ رہنے لگا۔ فسادات کے دوران اگر کوئی شخص بھولے سے دوسرے فرقے کے نرغے میں پھنس جاتا تو اس کی جان کی خیر نہ ہوتی۔ شہر میں افواہیں تیزی سے گشت کرتیں۔ سرحدوں پر مورچے لگ جاتے۔ ایک دوسرے پر سلگتی کانگڑیوں، پتھروں اور اینٹوں کی بارش ہوتی۔ کبھی کبھار آگ زنی تک نوبت پہنچ جاتی۔ دیر سویر پولیس آدھمکتی اور لاٹھیوں اور آنسو گیس سے دنگائیوں کو بھگانے کی کوشش کرتی مگر تب تک بہت نقصان

ہو چکا ہوتا۔ سورج ڈھلتے ہی سڑکیں ویران ہو جاتیں۔ پھر کئی روز یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا۔

ایسے پس منظر میں اسمال اور فاطی کی شادی ایک معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ سنا ہے دونوں ایسے محلے میں رہتے تھے جہاں ایک جانب شیروں کی آبادی تھی اور دوسری جانب بکروں کی۔ درمیان میں دس گیارہ کشمیری پنڈتوں کے مکان فصیل کا کام کرتے۔ البتہ فسادات کے دنوں میں یہی مکان بیڈمنٹن کورٹ کے جال کا کام بھی کرتے۔ دونوں جانب سے پتھر پھینکے جاتے جو اکثر و بیشتر پنڈتوں کی چھتوں پر بچھی ٹین کی چادروں پر بموں کی طرح گرتے۔ خوف و دہشت کا عجب سماں بندھ جاتا۔

ایک روز روزنامہ آفتاب میں چھپی کسی خبر پر ہنگامہ ہوا۔ پورے علاقے میں تناؤ بڑھ گیا اور دونوں فرقے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ دن بھر نعرے بازی اور پتھراؤ چلتا رہا اور شام ڈھلتے ہی بکروں کے ایک مکان سے آگ نمودار ہو گئی۔ ان بھیانک شعلوں میں اسمال کو ایک ہیولا سا نظر آیا۔ اسے یوں لگا کہ کوئی بے بس لڑکی مدد کے لیے باہیں پھیلا رہی ہے۔ نہ جانے کہاں سے اس کی جان میں طاقت عود کر آئی اور وہ سرعت سے آگ کی لپٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس ننھی سی جان کو اپنی گود میں اٹھا کر باہر لے آیا۔ لڑکی بچ تو گئی مگر اس کے ضعیف والدین آگ کی نذر ہو گئے۔ تماشائی اسمال کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہیں حیرت ہوئی کہ لنگڑے پن کے باوجود اس نے لڑکی کو بچا لیا اور وہ بھی ایسی لڑکی کو جو مخالف فرقے سے تعلق رکھتی تھی۔

اسمال یتیم لڑکی کو اٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ بھائی بندھوؤں نے اعتراض کیا مگر اس نے کسی کی نہ سنی۔ وہ فاطی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے آبائی گھر چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار کر لی۔

''جلنے دیا ہوتا۔ کیا ضرورت تھی مجھے بچانے کی......؟'' فاطی نے یہ سوال کئی بار اسے پوچھا۔ وہ آہستہ آہستہ بلوغت کی طرف قدم بڑھا رہی تھی مگر ماضی کی یادیں اس کا پیچھا چھوڑ نہیں رہی تھیں۔

''کیوں جلنے دیتا۔ اوپر والے کے سامنے بھی تو جواب دینا پڑے گا''۔

''جنہوں نے آگ لگائی، کیا انہیں جواب نہیں دینا پڑے گا؟''۔

''ان کی تو وہی جانیں۔ میں نے جو صحیح سمجھا کر لیا''۔

"تم اتنا بھی نہیں سمجھتے میں تمہاری دشمن ہوں۔ مخالف فرقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میری وجہ سے تمہارے بھائی بند ہو بچھڑ گئے۔ سبھی فرقے کے لوگ تم سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔ کہیں تمہیں کچھ ہو گیا تو......؟"

"ارے پگلی، خدا پر بھروسہ رکھو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے کمانے کے لیے دو ہاتھ دیے ہیں۔ میں کسی کا محتاج نہیں۔ ہاں بچپن میں حادثے میں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی ورنہ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔"

"اسمال اس دنیا میں اب میرا کوئی نہیں۔ تم مجھ کو چھوڑ کر مت جانا۔" فاطی کی التجا میں بے بسی صاف طور پر جھلکتی۔

"پھر وہی بات۔ تم اپنے دل سے یہ سارے وسوسے نکال لو۔ جب تک میں زندہ ہوں تم پر آنچ نہیں آنے دونگا۔" اسمال اس کی ڈھارس بندھا دیتا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس سانحے نے اسمال کو قبل از وقت بالغ بنا دیا تھا۔ اسے بہ خوبی احساس تھا کہ فاطی اب اس کی منکوحہ بیوی ہے جو اسے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ حالانکہ اس شادی کے باعث وہ دونوں اپنے رشتہ داروں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ نہ ان کی خوشی میں شریک ہو سکتے تھے اور نہ ہی ان کے غم میں۔ اس لیے ایک دوسرے کو سہارا دینا نفسیاتی ضرورت بن گئی تھی۔ اسمال نے یتیم فاطی کی زمین بیچ کر اور اپنے دوستوں سے ادھار مانگ کر اچھی خاصی رقم جمع کر لی۔ اس نے ایک برق رفتار سفید گھوڑا اور ایک خوبصورت تانگہ خرید لیا۔ گھوڑے کا نام 'نواب' رکھا اور پہلے ہی روز اپنی دل رُبا کو ڈل جھیل کے کنارے واقع مغل باغات کی سیر کرائی۔ وہ شرماتی لجاتی تانگے کی پچھلی سیٹ پر گٹھڑی کی مانند بیٹھی رہی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ دنیا اتنی خوبصورت ہوتی ہے۔

غریبوں کی آرزوئیں ہوتی ہی کتنی ہیں۔ بس پیٹ بھرنے کے لیے دو چار نوالے۔ ستر پوشی کے لیے دو گز کپڑا اور دل بہلانے کے لئے تھوڑی بہت تفریح۔ اس محدود دائرے میں رہ کر پوری زندگی بسر ہو جاتی ہے۔

اس روز کے بعد گھوڑے کی دیکھ بھال کرنا، وقت پر اس کو چارا ڈالنا، ناند میں پانی بھرنا اور اس کی لید صاف کرنا فاطی کا معمول بن گیا۔ وہ خوشی خوشی یہ سارے کام نپٹا لیتی۔ اُدھر اسمال صبح سویرے ناشتہ کرنے کے بعد تانگہ جوت لیتا۔ رنگ روغن اور براسو سے اس کو چمکاتا اور پھر شہر کی

سڑکوں پر دن بھر اسے دوڑاتا۔ کیا مجال کہ اس نے کبھی بھی نواب پر چابک مارا ہو۔ نواب اور اسمال کے تانگے کی دھوم سارے شہر میں تازہ خوشبو کی طرح پھیل گئی۔

بہر حال اسمال کی شخصیت کا ایک تاریک پہلو بھی تھا۔ وہ بہت غصیلا آدمی تھا۔ بات بات پر جھگڑتا خاص کر جب وہ شراب کے نشے میں ہوتا۔ اس وقت اس کی بیوی اور بچے بید کی مانند کانپتے۔ بچے تو آنکھیں بچا کر کونوں میں دبک جاتے لیکن وہ سارا غصہ اپنی بیوی پر اتار دیتا۔ فسادات کے دنوں میں وہ اور بھی بھڑک اٹھتا۔ افراتفری کے سبب بے کاری بڑھ جاتی۔ آمدنی کے سوتے سوکھ جاتے۔ جیبیں خالی ہو جاتیں اور ان کے ساتھ ہی خالی ہو جاتے اس کے دل و دماغ۔ اپنے خالی پن کو دور کرنے کی خاطر وہ شراب کا سہارا لیتا اور پھر نشے کی حالت میں آپے سے باہر ہو جاتا۔ اُدھر قرض خواہوں کے تقاضے بڑھتے اور اِدھر بچوں کی ضرورتیں۔ آسمان چھو رہی مہنگائی میں ایک طرف چار بیٹیوں کا پیٹ پالنا اور دوسری طرف گھوڑے کے چارے کا انتظام کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ نتیجتاً وہ فاطی پر برستا۔ پھر گھر میں بیچ بچاؤ کرنے والا بھی تو کوئی نہ تھا۔

یہی وہ وقت ہوتا جب فاطی بکرا فرقے کی نمائندہ بن جاتی جیسے فسادات اس کی شہ پر ہو رہے تھے۔ اس صورت میں اسمال اس کو اپنا کٹر دشمن تصور کرتا۔ نشے میں وہ یہ بھی بھول جاتا کہ فاطی کو پانے کے لیے اس نے طرح طرح کی اذیتیں جھیلی تھیں۔

بے پناہ محبت نفرت کی شدت میں تبدیل ہو جاتی اور بعض اوقات شعور کی حد پار کر جاتی۔

''سالی، حرامجادی، تم نے مجھے کہیں کا نہ رہنے دیا۔ نہ گھر کا......نہ گھاٹ کا......ماں باپ بھائی بہن سب بچھڑ گئے۔ اپنی جماعت میں میری کوئی وقعت نہیں رہی......اور تم......تم کو تو بس روپے کی پڑی ہے۔ کہاں سے لاؤں گا میں روپے۔ چار دن سے کام ٹھپ پڑ چکا ہے۔ اُدھر تیرے ماں جایے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ بلوا کر رہے ہیں۔ شیروں سے مقابلہ کرنے نکلے ہیں۔ مادر......سارے شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے۔''

ان پڑھ فاطی کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ وہ کیا سمجھے کہ گھر کے باہر مرد کن کن مصیبتوں سے جوجھتا رہتا ہے۔ اُسے لگتا تھا کہ اسمال دنیا کا واحد طاقت ور آدمی ہے، جو کسی بھی مصیبت سے لڑ سکتا ہے۔ آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہے۔ پھر دو چار روپے لانے میں کون سی قباحت ہے۔ اگر آمدنی نہیں ہے تو کسی سے ادھار مانگ لے۔ جہاں سے شراب کے لیے روپے آتے

ہیں وہیں سے گھر کے لیے بھی آئیں گے۔

''نشے میں ہی پڑے رہو گے یا کچھ گھر کی پھکر بھی کرو گے۔'' فاطی بعض اوقات بوکھلا اٹھتی۔

''اور کرنے کو رہا ہی کیا''۔ اسمال ٹکا سا جواب دیتا۔

''ارے، باہر جا کر دیکھ تو لے۔ شاید کرفیو میں ڈھیل دی گئی ہو۔ بازار کھل گیا ہو۔ دنگے ختم ہو چکے ہوں۔ لوگ باگ باہر نکل رہے ہوں۔ تم جب گھر کے باہر قدم رکھو گے تبھی تو پتہ چلے گا''

''حرام خور، میں کیا اپنی مرضی سے گھر میں بیٹھا ہوں۔ یہ تمہارے ہی تو رشتے دار ہیں، جو آئے روز دنگا کرتے ہیں۔ اس بار تو مولوی کے آدمیوں نے ہی آگ لگائی تھی۔''

''میں کیا جانوں مولبی کون ہوتا ہے۔ میرا تو سب کچھ تو ہی ہے۔ بھوکی بھی رکھے گا تو ایسے ہی پڑی رہوں گی۔ مگر ان بچیوں کی تڑپھ دیکھی نہیں جاتی۔ سو میں چلاتی ہوں''

ہر بار جھگڑے کی ابتداء طعنے مہنے سے ہو جاتی، پھر اسمال مغلظات پر اتر آتا جو کسی بھی ذی روح کے لیے ناقابل برداشت ہوتا۔ جب بات حد سے گزر جاتی تو فاطی پر جنون کا دورہ پڑ جاتا۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی۔ آخر نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی۔ گھونسے لاتوں کا تو حساب ہی نہیں رہتا۔ بارہا اسمال سوٹی لاٹھی سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس نے کسی مولوی دوست سے سنا تھا کہ عورت کو اس طرح رام کرنا مذہب میں جائز ہے۔ نتیجے میں فاطی کے بدن پر نیلے داغوں کی گل کاری ہو جاتی۔ وہ درد کے مارے گھنٹوں بلبلاتی رہتی۔

لڑکیاں ماں کی یہ حالت دیکھ کر اس کے اردگرد حفاظتی حلقہ بنا لیتیں اور اس کو مزید مار کھانے سے بچا لیتیں۔ کبھی کبھار سوٹی کی مار انہیں بھی کھانی پڑتی۔ اس وقت فاطی کو ایسا لگتا جیسے یہ ضربیں اس کے جگر کے ٹکڑے کر رہی ہیں۔

''آ گئی حرام زادیاں۔ پتا نہیں کس کا تخم ہیں۔ کوئی کام نہ دھام۔ بس کھانا پینا اور گل چھرے اڑانا!'' اسمال بیٹیوں کا برتاؤ دیکھ کر جھلا اٹھتا۔

''دیکھو جو بھی کہنا ہے مجھ سے کہو۔ ان بے چاری کسمت کی ماریوں کو مت مارو۔ انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا۔'' فاطی اسمال سے مخاطب ہوتی۔

''یہی تو ہیں جن کے باعث گھر میں اکال پڑا ہوا ہے۔ چلی آئی ایک کے بعد ایک۔''

''او جی، بچے تو خُدا کی دین ہوتے ہیں۔ ان کو کیوں کوستے ہو''۔

''ہونہہ۔ خُدا کے پاس کیا لڑکا نہیں تھا۔ بس یہی لڑکیاں بچی تھیں میرے لیے۔ لڑکا ہوتا کم سے کم ہاتھ تو بٹا لیتا۔ دو چار آنے کما کر لاتا۔'' وہ اور بھی زور سے غرانے لگتا۔

اس جھگڑے کی انتہا تب ہوتی جب لفظوں کی یہ جنگ عملی صورت اختیار کر لیتی۔ زدو کوب کے بعد آخر کار اسمال اپنی بیوی کی چوٹی پکڑ کر اسے گھر کے باہر دھکیل دیتا۔

''جاؤ، حرامجادی جہاں جانا ہے۔ جہنم بنا لیا ہے میری زندگی کو۔ جاؤ، چلی جاؤ۔ اب تم اس گھر میں رہنے کے لائق نہیں ہو۔''

لڑکیاں ششدر رہ جاتیں۔ وہ جلدی سے اپنی ماں کے دو چار کپڑے سمیٹ کر اس کے ساتھ لپٹ جاتیں۔ ٹوٹی ہوئی فاطی کے بوجھل قدم آہستہ آہستہ خالو زاد بہن کے گھر کی جانب اٹھتے۔

آگے آگے فاطی چلتی اور پیچھے پیچھے کم سن بیٹیاں۔ ایسا لگتا جیسے کسی ڈربے کی قید سے کوئی مرغی چھوٹ گئی ہو اور اس کے چھوٹے چھوٹے چوزے اس کا تعاقب کر رہے ہوں۔ عجیب دلگداز منظر ہوتا۔

شیر بکرے کے ان جھگڑوں نے ہر بار فاطی سے اس کا گھر بار چھین لیا۔ اس کو ان ناموس سے نفرت ہونے لگی۔ آئے دن کی لعن طعن اور مار پیٹ نے اس کے ذہن میں تنہائی اور بے بسی کا احساس جگایا تھا۔ وہ اسی احساس کے بوجھ تلے سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اب تو وہ نفسیاتی مرض میں بھی مبتلا ہو گئی تھی۔ اگر بیٹیوں کا سہارا نہ ہوتا شاید وہ اب تک پاگل خانے میں بھرتی ہو چکی ہوتی۔ اس چھوٹی سی ہجرت کے دوران وہ خود سے کئی سوال پوچھ لیتی۔ اپنی ہستی کے بارے میں، اپنے مستقبل کے بارے میں یا پھر عورت کی حیثیت کے بارے میں۔

''کیا میرے ساتھ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ میں بے سہارا عورت ہوں؟ کیا میرا اپنا کوئی گھر نہیں.....؟ کتنی بار میں اجڑی ہوں اور کتنی بار مجھے پھر سے بسایا گیا.....؟ کیا میرا کوئی وجود ہی نہیں.....؟ کیا عورت کا کہیں کوئی گھر نہیں ہوتا جسے وہ اپنا سمجھے، اپنا کہے۔''

اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ تھک ہار کر وہ چپ ہو جاتی اور حالات سے سمجھوتا کر لیتی۔

فسادات ختم ہوتے ہی زندگی پھر اپنے ڈھرے پر آجاتی۔ دو چار روز میں سب کچھ معمول پر آجاتا۔ لیکن اسمال کے گھر میں پھر بھی ویرانیوں کا بسیرا رہتا۔ گھوڑے کی ہنہناہٹ اسے کچوٹتی۔ نواب اپنی مالکن کو ڈھونڈتا رہتا۔ اسمال خود ہی اس کے سامنے کھلی، بھوسا یا پھر گھاس ڈال دیتا۔ اس کے کونڈے میں پانی بھر دیتا مگر نواب تھا کہ روٹھا ہی رہتا۔ چارے کو منہ بھی نہ لگاتا۔ دن بھر تانگے میں جُتنے کے باوجود گھر آکر وہ غمگین رہتا اور صدر دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے اپنی مالکن کا انتظار کرتا۔

ایسا نہیں تھا کہ اسمال کو اپنے کیے پر پچھتاوا نہیں ہوتا۔ رات بھر وہ اسی سوچ میں پڑا رہتا کہ آخر کیوں اس نے فاطی کو گھر سے نکالا؟ فاطی کا قصور کیا تھا؟ وہ خود اس کے گھر میں تو نہیں آئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ بار بار وہ ایسی غلطی کیوں کر بیٹھتا ہے۔ اس نے کتنی بار توبہ کرلی۔ قسمیں کھائیں کہ مستقبل میں پھر کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود وہ بار بار اس فعل کو دہراتا۔ اور پھر غصہ ٹھنڈا ہوتے ہی بیوی اور بچوں کو یاد کرنے لگتا۔

جھینپتا شرماتا وہ فاطی کی خالہ زاد بہن کے گھر چلا جاتا۔ منت سماجت کرتا۔ فاطی کے سامنے گڑگڑاتا اور اپنی غلطی قبول کرلیتا۔

''بہن۔ اس کو سمجھاؤ۔ آخر اس کا گھر تو وہیں ہے۔ یہاں کتنی دیر بیٹھی رہے گی۔'' اسمال فاطی کی خالہ زاد بہن سے مخاطب ہوتا۔

''وہ کیا سمجھائے گی موئے۔ تم تو جنگلی درندے ہو۔ تمہارے ساتھ میں نہیں جاؤں گی۔''

''ارے اب معاف بھی کرو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب چلو گھر چلیں۔''

''کون سے گھر؟ میرا کوئی گھر نہیں۔ میرا گھر تو بچپن ہی میں جل گیا تھا۔ اسی کے ساتھ جل گئے تھے میرے ماں باپ۔ اور میرے ارمان......! میں یتیم ہوں۔ یتیموں کا کوئی گھر نہیں ہوتا''۔

''تمہاری بات صحیح ہے۔ لیکن شادی کے بعد تو سسرال ہی تمہارا گھر ہے۔ اب چلو بھی۔ میری خاطر نہیں کم سے کم نواب کی خاطر ہی چلو۔ وہ تمہارے بغیر تڑپ رہا ہے۔ وہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ بس صدر دروازے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہتا ہے۔''

نواب کا واسطہ دینا ہی فاطی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کے برابر ہوتا۔ فاطی کی آنکھوں سے

جھرنا بہنے لگتی۔ رونی آواز میں وہ اپنے شوہر سے کہتی۔

''میں تو تمہارے ساتھ آؤں گی مگر مجھے معلوم ہے کہ دوسرا فساد ہوا نہیں اور میں پھر گھر سے بے گھر ہو جاؤں گی۔ ان بچیوں کے لیے میں یہ اہانت بھی سہنے کو تیار ہوں۔''

لڑکیاں پہلے ہی سے گھر جانے کے لیے تیار کھڑی ہوتیں۔ بڑی لڑکی ماں کے کپڑوں کو اخبار میں لپیٹ کر دروازے پر انتظار کرتی اور پھر فاطی کی ایک اور بدھائی ہوتی۔ بینڈ باجے کے بدلے رونے کی آوازیں اس کا تعاقب کرتیں۔

پھر ایک فساد سے لے کر دوسرے فساد تک فاطی کا گھر بس جاتا۔ واپسی پر اس کے من میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے۔

''عورت بھی کتنی لاچار ہوتی ہے! اتنی بے عزتی اور زد وکوب کے بعد بھی میں اسی چوکھٹ پر سجدہ دینے جا رہی ہوں! کیا معلوم کب تک وہاں رہ پاؤں گی......؟ نواب اور یہ لڑکیاں نہ ہوتیں، میں کب کی دریائے جہلم میں کود گئی ہوتی۔ اسمال کو شاید میری ان کمزوریوں کا اندازہ ہو چکا ہے۔ ہر بار نواب کا واسطہ دیتا ہے۔''

چلتے چلتے وہ کئی بار پتھروں سے ٹکرانے کے باعث لڑکھڑاتی مگر دفعتاً اپنے آپ کو سنبھالتی اور پھر اسی تصور کے عالم میں کھو جاتی۔ یہ سلسلہ تب تک چلتا رہتا جب تک وہ نواب کی ہنہناہٹ نہ سنتی۔ اس کی جان میں جان آجاتی اور وہ دوڑ کر اسے گلے لگا لیتی۔ موٹے گرم آنسو نواب کی گردن کے بالوں میں جذب ہو جاتے۔

فاطی کئی بار گھر سے بے گھر ہوئی۔ ہر بار وہ بچوں کو لے کر شوہر کو کوستی ہوئی سسرال سے نکل جاتی۔ بچوں کے ہاتھ میں پوٹلی ہوتی جس میں دو چار پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ یہ پوٹلی فاطی کو بہت عزیز تھی۔ یہی اس کی زندگی کی پونجی تھی جس پر وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔ باقی سب کچھ پرایا معلوم ہوتا۔''

تعجب تو اس بات کا تھا کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اسمال نے کبھی طلاق دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت بھی نہیں جب اس کا غصہ انتہا کو پہنچ جاتا۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بات کہیں رَچ بس گئی تھی کہ حالات نارمل ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور گھر میں پھر وہی شور وغل مچ جائے گا۔

اسمال اور فاطی کی چاہت اور نفرت کی انوکھی داستان یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ گذشتہ سال فاطی کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ وہ رات بھر تڑپتی رہی۔ درد کے مارے اس نے آسماں سر پر اٹھالیا۔ اس سے پہلے بھی فاطی کئی بار بیمار ہو چکی تھی، چار لڑکیوں کو جنا تھا مگر ایسا درد اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

اسمال بھی حیرت زدہ تھا۔ بیٹیاں ماں کی کراہٹ سن کر خوف زدہ ہو گئیں۔ وہ فاطی کی تیمارداری میں لگ گئیں۔ اسمال نے رات میں کئی بار نماز ادا کی۔ سبھی نے آنکھوں میں رات کاٹ لی۔

پو پھٹتے ہی اسمال نے اپنا تانگہ جوتا اور فاطی کو پچھلی سیٹ پر بٹھالیا۔ بیٹیاں بھی ساتھ میں ہولیں۔ باہر دفعہ ۱۴۴ لگا ہوا تھا۔ ماحول میں تناؤ صاف نظر آرہا تھا۔ اکادکا آدمی سڑکوں پر سہم سہم کر چل رہے تھے۔ سڑکوں پر پتھر، اینٹیں، پھٹی چپلیں اور ٹوٹی ہوئی کانگڑیاں جابجا بکھری پڑی تھیں۔ شیروں اور بکروں میں کل رات سے پھر لڑائی چھڑ گئی تھی۔ کہیں کسی موڑ پر چند ایک پولیس والے بھی نظر آرہے تھے۔ اسمال نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ وہ جان کی بازی لگا کر تانگے کو برق رفتاری سے بھگائے جارہا تھا۔ پہلی بار وہ چہیتے نواب پر کوڑے برسا رہا تھا۔ اس کے سر پر جنوں سوار تھا کیونکہ وہ اپنی بیوی کو مرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

آخر کار وہ اسٹیٹ اسپتال پہنچ گیا۔ فاطی کو آئی سی یو میں داخل کرایا۔ پیشاب اور خون کے ٹیسٹ کرائے۔ سونوگرافی اور ایکسرے فوٹو کھنچوائے۔ پھر اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کی ٹیم نے معائنہ کیا۔ مرض کی تشخیص کی۔ معلوم ہوا کہ فاطی کے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے ہیں۔

''تمہاری بیوی کے دونوں گردے خراب ہو چکے ہیں۔'' ایک ڈاکٹر نے اسمال کو اپنے پاس بلاتے ہوئے اطلاع دی۔ اسمال پر بجلی سی گری۔ وہ دم بہ خود ڈاکٹر کو دیکھتا رہا جیسے کہہ رہا ہو کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا ہے۔

''اگر کوئی رشتے دار اپنا ایک گردہ عطیے میں دے سکتا ہے تو امید ہے مریضہ بچ جائے گی۔ اور ہاں، یہ اسپتال تو گورنمنٹ کا ہے مگر کچھ ادویات وغیرہ آپ کو بازار سے خریدنی پڑیں گی۔ پھر خون کا انتظام بھی کرنا پڑے گا۔''

صاحب، میں تو غریب آدمی ہوں۔ اس میں کتنا خرچہ لگ سکتا ہے۔''

10

''یہی کوئی بیس پچیس ہزار!''

ڈاکٹر کی بات سن کر اسمال پریشان ہوگیا۔ ''کون دے گا گردہ! فاطی کا کوئی قریبی رشتے دار تو ہے نہیں جو اپنا گردہ دے۔ گردہ یا تو میں دے سکتا ہوں یا پھر بیٹیاں! وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ بیٹیوں کا تصور کرتے ہی اس کے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوگئی۔ ''انہوں نے تو ابھی زندگی دیکھی بھی نہیں۔ پھر ان کو گردے سے محروم کرنا بہت بڑا گناہ ہوگا۔''

فاطی کو بیٹیوں کی دیکھ ریکھ میں چھوڑ کر اسمال تانگہ لے کر چل پڑا۔ پہلے تو قرضہ لینے کی کئی جگہ کوشش کی مگر ہر جگہ ناکامی ہاتھ لگی۔ اس کو ایسا لگا جیسے رات بھر ہی میں ساری کائنات بدل چکی ہو۔ کوئی چہرہ شناسا نہیں لگ رہا تھا۔ مجبوراً وہ اس بازار میں پہنچ گیا جہاں تانگوں اور گھوڑوں کی تجارت ہوتی تھی۔ بیس ہزار کا سودا طے ہوا۔ اس نے نم آنکھوں سے نواب کی پیشانی چوم لی اور اسکو خریدار کے حوالے کر دیا۔

''صاحب! نواب میرا گھوڑا نہیں ہے، یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کو میں نے اپنے خونِ جگر سے پالا ہے۔ میں اپنا بیٹا آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اس کا خیال رکھ لینا۔''

وہ مڑا اور پھر پلٹ کر نواب کو دیکھنے کی ہمت بھی نہ جٹا پایا۔ اسپتال پہنچتے ہی اس نے ساری رقم اپنی بڑی بیٹی کے حوالے کر دی اور خود ڈاکٹر سے درخواست کی کہ اس کا گردہ فاطی کے جسم میں منتقل کر دیں۔

اس نے اپنا روزگار اور مستقبل دونوں داؤ پر لگا دیے۔

رات بھر دونوں میاں بیوی زندگی اور موت سے جوجھتے رہے۔ ڈاکٹروں نے اسمال کا گردہ نکال کر فاطی کے جسم میں ٹرانسپلانٹ کر دیا۔ آپریشن کامیاب ہوا۔

پھر صبح کا سورج نئی امیدیں لے کر طلوع ہوا۔ اسپتال کے ایک بیڈ پر فاطی بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور دوسرے بیڈ پر اس کا شوہر۔

کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد دونوں کو ہوش آیا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کو تلاش رہی تھیں۔ بکرے کے جسم میں شیر کا گردہ دہاڑ رہا تھا۔ سامنے چاروں بیٹیاں خاموش اپنے ماں باپ کے زرد چہروں کو یوں تک رہی تھیں جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آ رہا ہو۔

●□●

# منقولہ خواب

یادِ ماضی اس کے لیے عذاب بن چکا تھا۔ بچپن میں وہ اور اس کی بہنیں ایک ایک نوالے کے لیے ترستی تھیں۔ ماں کی چھاتی سے الگ اس نے کبھی گائے کا دودھ نہیں چکھا تھا۔ ماس مچھلی کی تو بات ہی نہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا تو اسے احساس ہوتا جیسے وہ مسلسل جدوجہد کے بعد کسی تاریک غار سے نکل آیا ہو۔ مجروح ومضروب۔ عدم تحفظ اور غیر یقینیت نے اس کو قدم قدم پر ستایا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ اپنے ماضی سے ہمیشہ خوفزدہ رہا اور اس کو بھلانے کی شعوری کوشش کرتا رہا۔ وہ زندگی کے ہر موڑ پر اس کینچلی کو اتار کر پھینک دینا چاہتا تھا۔

جیالال کا باپ ایلو پیتھک دوائیوں کے ایک تھوک بیوپاری کے ہاں ملازم تھا۔ پرچون فروشوں سے آرڈر لینا اور پھر دوائیاں پیک کر کے ان تک پہنچانا اس کا روزمرہ تھا۔ مالک نے اس کے رہنے کا انتظام اپنے ہی مکان میں گیراج کے اوپر والے کمرے میں کیا تھا تا کہ وہ چوبیس گھنٹے دستیاب رہے۔ مالک کے گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی اس کے ذمّے تھا۔ اس کے عوض جیالال کو دو وقت کی روٹی اور دوسو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ مہینے کی تنخواہ اپنی بیوہ ماں کے حوالے کر دیتا۔ بیوی تیسرے بچے کو جنم دیتے وقت اینیمیا کے باعث پرلوک سدھار چکی تھی لیکن ماں اس کے بچوں کی پرورش میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی۔ بہر حال وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا۔ حالانکہ ان کے پاس نہ زمین تھی نہ جائیداد۔ صرف ٹوٹی چھت کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس کے باوجود دوسو روپے میں وہ اپنا پیٹ کاٹ کر گزربسر کر ہی لیتے تھے۔ ان دنوں تعلیم تجارت نہیں بنی تھی۔ یونیورسٹی تک گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں مفت تعلیم مہیا کی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جیالال اور اس کی بہنوں کو حصولِ تعلیم میں کوئی دِقت پیش نہیں آئی۔ بہنیں تو میٹرک پاس کرتے ہی بیاہی گئیں مگر جیالال پڑھنے کے معاملے میں کافی ذہین اور ہونہار ثابت ہوا۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر کے جیالال ڈاکٹری کے خواب دیکھنے

لگا۔ باپ نے لاکھ سمجھایا کہ ہماری حیثیت ایسی نہیں ہے کہ تم ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرسکو مگر وہ نہ مانا۔ کہتے ہیں نصیب بھی بہادروں کا ساتھ دیتا ہے۔ حکومت نے آر.جی کار میڈیکل کالج کولکتہ کے لیے نامزد کیا اور ساتھ ہی وظیفہ بھی منظور کرلیا۔ روزمرہ کے اخراجات کے لیے جیالال کالج ٹائم کے بعد دو تین ٹیوشن پڑھاتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال گزر گئے۔

واپس آکر جیالال کو گورنمنٹ اسپتال میں نوکری مل گئی۔ ان دنوں ڈاکٹر بننا کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ نوکری ملتے ہی شادی کے پیغام بھی آنے لگے مگر جیالال انہیں ٹالتا رہا۔ اس بات سے آزردہ ہوکر آخرکار پتا جی نے اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی لی۔

"بیٹے اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کون جانے کس گھڑی بلاوا آجائے۔ تمہاری ماں زندہ ہوتی تو الگ بات تھی۔ تمہاری بہار دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئی ہیں۔ میری اچھا ہے کہ تم اب جلدی شادی کرلو۔"

جیالال خاموش رہا۔ نہ ہاں کی نہ ناں۔ پتا جی کی اس جذباتی درخواست کے سامنے وہ کچھ بھی نہ کہہ پایا۔

"اپنے مالک ہیں ناں۔ انہوں نے تمہارے لیے ایک رشتہ ڈھونڈ لیا ہے۔ کہتے تھے جیالال کو ہم اپنے بیٹے سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس کا بھلا بُرا ہم سے بڑھ کر اور کون سوچ سکتا ہے۔ بیٹے بات بھی صحیح ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہم پچھلی تین پیڑھیوں سے ان کے نمک خوار ہیں۔ آج اس گھر میں اگر چند خوشیاں نظر آرہی ہیں سب ان کی بدولت ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو اور مالک سے خود ہی بات کرلو۔

جیالال بدستور خاموش رہا اور کپڑے بدل کر اپنے پتا جی کے ہمراہ چل دیا۔ وہ مالک کے سامنے صوفے پر بے دھڑک بیٹھ گیا جبکہ اس کے پتا جی کو ہچکچاہٹ سی محسوس ہورہی تھی۔ اس لیے بیٹے کے پیچھے ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہا اور مالک سے استدعا کی۔ "صاحب جی، آپ اس کو خود ہی سمجھائیے اور مجھے آگیا دیجیے۔ اندر مالکن نے کسی کام کے لیے بلایا ہے۔"

اپنی بات سمجھانے کے لیے مالک نے لمبی تمہید باندھ دی۔ جیالال کے ماضی کا خاکہ اس طرح کھینچا تاکہ اس کو اس بات کا احساس ہو کہ اگر وہ نہ ہوتے تو آج جیالال ڈاکٹر نہ ہوتا۔ جیالال کو اپنی کم ظرفی اور مفلوک الحالی کا شدید احساس ہونے لگا۔ پر کٹے پرندے کی مانند

وہ دیر تک چھٹپٹاتا رہا مگر مصلحتاً خاموش رہا۔

اس کے بعد مالک نے اپنا مدعا بیان کیا۔ ''بیٹے، تمہیں شاید معلوم ہوگا کہ میرا سالا قالینوں کا بہت بڑا تاجر ہے۔ اسی شہر میں اس کے تین کارخانے ہیں۔ دلی اور بمبئی میں دکانیں ہیں۔ لاکھوں کا ایکسپورٹ کرتا ہے۔ ان کی اکلوتی لڑکی ہے۔ نشا۔ عمر میں تم سے دو تین سال چھوٹی ہوگی۔ البتہ پیدائش سے اسکی ایک ٹانگ میں تھوڑا بہت لنگ ہے۔ بہت معمولی سا۔ دیکھنے میں بھلی چنگی نظر آتی ہے۔ یوں تو نظر نہیں آتا مگر غور کرنے ہی سے معلوم پڑتا ہے۔ وہ لوگ تمہیں ایف آر سی ایس کرنے کے لیے لندن بھیجنے کا انتظام کر سکتے ہیں اور اس کا خرچہ برداشت کریں گے۔ اگر تم ہاں کر دو تو!''

جیالال کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زندگی کے پہلے ہی پڑاؤ پر اسے ماضی کی عنایات کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ تاہم اس نے بڑے صبر و تحمل سے کام لے کر جواب دیا۔

''ہمارے گھر میں یہ فیصلے میری دادی کرتی ہیں۔ وہ جو مناسب سمجھیں گی، مجھے وہ منظور ہوگا۔ کل تک آپ کو اطلاع مل جائے گی۔''

گھر لوٹ کر جیالال اسی دبدھا میں کھویا رہا۔ نہ جانے کیسی لڑکی ہوگی؟ کس قدر لنگڑی ہوگی؟ بچپن ہی سے اس نے کتنے حسین خوابوں کے مینار کھڑے کیے تھے۔ وہ سب ڈھتے نظر آنے لگے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ پتا جی اپنی وفاداری کی وجہ سے انکار نہیں کریں گے۔

اس رشتے کے بارے میں کچن میں مالکن نے پتا جی کو سب کچھ بتا دیا تھا اور لڑکی کی تصویر بھی دکھائی تھی۔ واپسی پر اس نے اپنی ماں کو اس بارے میں معلومات فراہم کیں۔ دادی سنتے ہی بپھر گئیں۔ ''ہائے ہائے، دنیا میں لڑکیوں کا اکال پڑ گیا ہے کیا۔ میرے لال کے لیے اور کوئی لڑکی نہیں سوجھی تمہیں۔ میں تو اپنے جگر کے ٹکڑے کے لیے آسمان سے پری اتار کر لاؤں گی۔ باڑھ میں جائے ولایت کی پڑھائی۔ میں تو چاہتی بھی نہیں کہ اب یہ پھر میری نظروں سے دور ہو۔ میں دوبارہ اسے الگ نہیں رہ سکتی۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے یہ پانچ سال کیسے گزارے ہیں۔ رہنے بھی دو مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔''

دادی کا جواب سن کر جیالال خوش ہوا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا۔ ''یہ تو سودا ہے سودا۔ میرے

ارمانوں کا، میری تمناؤں کا۔ان بیوپاریوں کا کیا۔وہ تو ہر چیز کو سکوں سے تولتے ہیں۔انہیں جذبات سے غرض ہے نہ احساسات سے۔وہ ہم غریبوں کو محض ٹھیکرے سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں۔"

"ماں، تم سمجھتی کیوں نہیں۔ کتنے احسانات ہیں ہم پر ان لوگوں کے۔ میرے دادا جی، پھر پتا جی اور پھر میں۔ تین پشتوں سے ہم ان کا نمک کھا رہے ہیں۔ کیا مجال کہ انہوں نے مجھے کبھی نوکروں کی طرح برتاؤ کیا ہو۔ یہ تو ان کا بڑا پن ہے کہ ہم سے رشتہ جوڑ رہے ہیں۔ ورنہ کہاں راجہ بھوج اور کہاں کنگلا تیلی۔"

"میں نے کب اس بات سے انکار کیا کہ ہماری تین پیڑھیاں ان کی نمک خوار نہیں ہیں۔ مگر بیٹے ایسا احسان بھی کیا جس کے عوض ہماری خوشیاں ہی چھن جائیں۔ جبھی تم لوگوں نے جی جان لگا کر کام کیا تب ہی تو انہوں نے ہماری جھولی میں دو روٹیاں پھینکیں۔ مفت میں کوئی خیرات تھوڑے ہی دیتا ہے۔"

"اری ماں، تم پوتے کی محبت میں اندھی ہو رہی ہو۔ کچھ سماج اور وفاداری کا بھی خیال کرو۔ جو سنے گا وہ کیا کہے گا۔ ایک معمولی سی بات کے لیے ان لوگوں نے اپنے مالک کی بات ٹھکرا دی۔ اور پھر یہ نقص بھی تو معمولی ہے۔ میں نے لڑکی کی تصویر دیکھی ہے۔ شکل وصورت سے تو اچھی لگ رہی ہے۔ کچھ تو ہمیں نظر انداز کرنا ہی پڑے گا۔ پھر ایسے خاندان سے رشتہ کرنے میں ہمارا مرتبہ بھی تو بڑھ جائے گا۔ ویسے بھی کیا معلوم کہاں رشتہ طے ہوگا اور وہ لڑکی کیسی ہوگی۔ صورت سے سیرت تھوڑے ہی معلوم ہوتی ہے۔ آخر جو لوگ ہم سے رشتہ جوڑیں گے وہ بھی تو ہماری پوزیشن پر غور کریں گے۔"

دادی کا پارہ یک دم نیچے گر گیا۔ کہنے لگیں۔ "ٹھیک ہے بیٹا۔ جیسے تم مناسب سمجھو، ویسے کرلو۔ تم نے تو گھر کے باہر بہت ساری دنیا دیکھی ہے۔ میں تو ٹھہری کنویں کی مینڈک۔ ان پڑھ، جاہل اور گنوار عورت۔ زندگی کی ان بھول بھلیوں کے بارے میں کیا جانوں۔"

آخر کار یہ طے پایا کہ جیالال کی شادی نشا ہی سے ہوگی۔ جیالال نے مجبوراً اس فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ حالاں کہ اس کے ارمانوں کا خون ہو رہا تھا۔ وہ اپنی غربت اور مفلسی کو کوسنے لگا۔ رات میں وہ کئی بار ڈراونے سپنے دیکھا کرتا۔ ماضی اس کی زندگی کے ساتھ جونک کی مانند لپٹا ہوا تھا۔ اتنی محنت ومشقت کرنے کے باوجود اور اتنی کامیابیوں سے سرفراز ہونے کے

باوجود وہ اس تار تار ہوئے پیراہن کو اپنے وجود سے الگ نہیں کر سکا۔

جیالال کو ہمیشہ اس بات کا احساس رہا کہ وہ تجارت کی منڈی میں بکا ہوا زرخرید غلام ہے۔شادی نے اس کے پاؤں میں ایسی بیڑھیاں پہنائی تھیں جن کے زخم کبھی مندمل نہ ہوئے۔وہ نِشا کو اپنی زندگی کا گرہن سمجھتا رہا حالاں کہ اس بات کا کھلے طور پر کبھی اظہار نہ کیا۔چند ہی مہینوں میں انگلستان میں اس کے داخلے کا انتظام ہوا اور وہ مزید تعلیم کے لیے سمندر پار چلا گیا۔پڑھائی کا سارا خرچہ اسکے سسر نے اٹھا لیا۔تعلیم مکمل ہونے کے بعد جیالال لندن ہی میں نوکری کرنے لگا۔

ادھر نِشا کی آنکھیں اپنے شوہر کی راہ تکتے ہوئے تھک گئیں لیکن اسے آنا تھا اور نہ آیا۔پہلے دادی بھگوان کو پیاری ہو گئیں اور پھر پتا جی سورگباش ہو گئے۔جب سسرال کی چاردیواری نِشا کے لیے عذاب بن گئی وہ اپنے میکے واپس چلی آئی۔وہاں اس کے ماں باپ پہلے ہی غم واندوہ کے پیکر بنے بیٹھے تھے۔لڑکی کا کنواری رہنا بیاہتا عورت کا میکے میں پڑے رہنے سے کہیں بہتر سمجھا جاتا ہے۔لوگ باتیں کرتے مگر ان سے کوئی جواب نہ بن پاتا۔لڑکی کے پھوپھا اور پھوپھی بھی پریشان تھے اور خود کو قصوروار ٹھہراتے تھے۔

جیالال نے اپنے ہی اسپتال کی ایک لیڈی ڈاکٹر لنڈا جونس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔حالاں کہ یہ فیصلہ اس کے لیے کوئی آسان کام نہ تھا۔وہ اپنے ضمیر کو سمجھانے کی بہت کوشش کرتا پھر بھی اپنے درون کی آواز کو دبا نہ پایا۔

''ایک بھولی بھالی لڑکی کو اس طرح منجدھار میں چھوڑ کر دوسری شادی کرنا کہاں کا انصاف ہے؟'' اس کا ضمیر بار بار کچوٹتا۔

وہ ہر بار اپنے ضمیر کو بس ایک ہی جواب دیتا۔''انصاف، کہاں کا انصاف! اس لڑکی کو منجدھار میں میں نے نہیں بلکہ اس کے اپنے ماں باپ نے دھکیل دیا۔انہوں نے ہی اس کو تجارت کی شَے بنا کر اس کا سودا کر لیا۔''

''ٹھیک ہے، سودا ہی سہی۔تم نے تو اس کو اپنا رفیقِ حیات تسلیم کر لیا ہے۔اب دھوکا دینا تمہیں شوبھا نہیں دیتا۔'' اندر سے پھر وہی آواز آتی۔

''کیوں نہیں۔انہوں نے میری غربت اور مفلسی سے فائدہ اٹھا کر مجھے اس بندھن میں

جبراً باندھ لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مجھے اپنی دولت سے خرید لیں گے۔ ہاں، وقتی طور پر وہ کامیاب ہوئے۔ مجھے اس وقت ان کی دولت کی ضرورت تھی، اس لیے بک گیا۔ اب میری باری ہے۔ میں نے ان زنجیروں کو توڑ دیا ہے۔ میں ان کی پہنچ سے بالکل باہر چلا گیا ہوں۔ وہ جو چاہیں کر لیں۔ میں تو دوسری شادی کر کے ہی رہوں گا"۔

"تم کتنے سنگ دل ہو۔ تم نے ان کو سیڑھی بنا کر اپنی منزل پا لی اور اب سیڑھی کو ہی اپنے سے الگ کر رہے ہو۔"

"یوں ہی سمجھ لو۔ اب مجھے اس سیڑھی کی ضرورت نہیں۔ منزلیں اور بھی ہیں۔ پھر میں کیوں راستے ہی میں رک جاؤں۔"

"تم انسان نہیں شیطان ہو۔ کیا تم نے سوچا ہے کہ اس معصوم لڑکی کا کیا ہوگا، جو تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہوئی ہیں؟"

"وہ اپنے والدین کے کرموں کی سزا بھگت رہی ہے۔ ان کی چالاکیوں کی بلی چڑھ گئی ہے۔ میں اس کا گناہ گار نہیں بلکہ اس کے گناہگار تو اس کے اپنے ماں باپ ہیں۔"

"لیکن اس میں اس بے چاری کا کیا قصور۔ وہ تو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہی ہے۔ لاچار عورت ہے۔ اب نہ گھر کی رہے گی اور نہ گھاٹ کی۔ چاہے کسی کی بھی غلطی ہو، بھگتنا تو اسی کو پڑے گا۔"

"اس بات سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ میں نے شادی سے پہلے اس کو دیکھا بھی نہ تھا۔ میرا کنٹریکٹ تو اس کے پھوپھا سے ہوا تھا۔ سو میں نے اس کی کارستانیوں کا جواب دے دیا۔"

جیالال نے اس دوران شراب کے کئی جام پی ڈالے۔ یہاں تک کہ اب اس کا ذہن کام کرنے سے کترا رہا تھا۔ اس نے اپنے ضمیر کا مکمل طور پر گلا گھونٹ دیا۔ اس کو پتہ بھی نہ چلا کہ لنڈا کب آ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ جام پر جام چڑھا رہی تھی۔

پھر دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے بار سے نکل آئے اور گھر کے لیے ٹیکسی لے لی۔ ساری رات زبان سے زیادہ ان کے جسم بولتے رہے۔ ایک مہینے کے اندر ہی دونوں نے رسم نبھانے کے لیے کورٹ میں اپنی شادی رجسٹر کروائی۔

●□●

# آواز کا جادُو

۱۹۸۶ء کی بات ہے۔ میں نے متھرا میں لیفٹنٹ کرنل اوم پرکاش سے چارج لے لیا۔ وہ ریٹائر ہو رہا تھا جبکہ میری عمر ابھی چھتیس سال کی ہی تھی۔ نیا نیا پرموشن تھا۔ اس لیے دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ پہلا دن بہت دوڑ دھوپ میں گزرا۔ چارج لینے کے رسوم کو پورا کر کے میں فارمیشن کے اعلیٰ افسروں سے ملنے گیا۔ جنرل آفیسر کمانڈنگ نے میرے کندھوں پر ایک اور سٹار کا اضافہ کیا اور بڑی شفقت سے ہاتھ ملا کر رخصت کر لیا۔ فارمیشن میں جتنے بھی کرنل دکھائی دے رہے تھے، عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے۔ مجھے دل ہی دل میں اپنے اوپر فخر محسوس ہو رہا تھا۔

آفس لوٹا تو سب سے پہلے سنٹرل کمانڈ میں اپنے باس کو خبر دینے کے لئے ٹیلی فون گھمایا۔

''ہیلو گڈ مارننگ سر'' دوسری جانب سے مدُھر آواز نے میرا خیر مقدم کیا۔

''ہیلو، گڈ مارننگ! ذرا کمانڈ میں ڈی ڈی اے پی ایس سے بات کروا دیجیے''۔ میں نے اپنے لہجے میں سنجیدگی کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''سر آپ نے کب جوائن کر لیا؟''

''آج ہی۔ یہی دو تین گھنٹے ہو گئے۔''

''ہاں سر، کرنل اوم پرکاش نے بتایا تھا کہ وہ ریٹائر ہو رہے ہیں۔ سر، آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔''

''میں، میں وَن زیرو ون ایریا سے پرموشن پر آیا ہوں۔''

''پھر تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ بہت بہت بدھائی ہو۔ سر پرموشن ہے تو مٹھائی بھی ہونی چاہیے۔'' وہ بلا تکلف بولے جا رہی تھی اور میں حیرانی سے سن رہا تھا۔ نہ جان نہ پہچان۔ پھر اتنی بے تکلفی! دوسرے لمحے خیال آیا شاید کرنل اوم پرکاش کو اچھی طرح جانتی ہو گی۔ اس کے انداز تخاطب سے لگ رہا تھا کہ بڑی ملنسار قسم کی لڑکی ہو گی۔

خیر گفتگو ختم ہوئی۔ اس نے مطلوبہ نمبر ملا کر دے دیا۔ میں نے لکھنؤ میں اپنے باس کو جوائن کرنے کی رپورٹ دے دی۔

آپریٹر سے گفتگو کا سلسلہ یوں ہی بے دھڑک چلتا رہا۔ اس کی آواز میں عجیب سی مٹھاس اور سریلا پن تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ کانوں میں رس گھول رہی ہو۔ ایک تو آواز کی ملائمت اور رسیلا پن اور اس پر لکھنوی لب ولہجہ۔ جی چاہتا تھا بس اس کو سنتا رہوں اور ٹیلیفون چھوڑنے کا نام ہی نہ لوں۔ بہر حال دفتر کا کام تو کرنا ہی تھا اور ادھر وہ بھی محتاط رہتی تھی۔ ایکسچینج میں اُسے اوسطاً ہر پانچ منٹ کے بعد کسی نہ کسی افسر کو ٹیلی فون ملا کر دینا پڑتا تھا۔ چاہتی بھی تو زیادہ دیر بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ تھوڑا بہت ٹائم نکال کر ٹیلیفون کر لیتی۔ باتیں تو خیر خوب ہوتی تھیں مگر کام کی بات ایک بھی نہیں۔ آخر کار میں نے ہی پہل کر لی۔

''تم ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے لیے آڈیشن کیوں نہیں دیتیں؟ تمہاری آواز اتنی سریلی ہے کہ اناؤنسر کا کام بخوبی نبھا سکتی ہو۔'' لڑکی کی تعریف کرنا اس کے دل میں گھر بنانے کے مترادف ہوتا ہے۔

''سر تھینک یو ویری مچ، اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ اس میں جھمیلے بھی تو بہت ہونگے۔ اب تو بس یہ نوکری ہی غنیمت ہے۔''

''نہیں تم ایسا کیوں سوچتی ہو۔ تم کوشش تو کر لو۔ تمہاری آواز ٹیلیفون پر اتنی مدھر لگتی ہے۔ ریڈیو پر اور بھی اچھی لگے گی۔ تم اپنے ٹیلنٹ سے بالکل ناواقف ہو۔''

''تھینک یو سر، تھینک یو ویری مچ۔ یو ہیو میڈ مائی ڈے۔'' یہ کہہ کر اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر لیا۔

پھر کئی روز ہماری آپس میں بات نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ تھی کہ میں انسپکشن کرنے کی غرض سے جھانسی اور بینا چلا گیا۔ وہاں بھی کئی بار دل میں خیال آیا کہ ٹیلیفون پر بات کر لوں مگر دل نہیں مانا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں کسی کو شک نہ ہو اور بات پھیل نہ جائے۔ ویسے بھی افسروں کی کمزوریاں جاننے کے لیے ان کے ماتحت ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں۔ اس لیے میں نے ضبط سے کام لینا ہی مناسب سمجھا۔

میں ہفتہ بھر دورے پر رہا۔ اس دوران پریتی کو سوتے جاگتے یاد کرتا رہا۔ خلوت میں اس کی

آواز میرے کانوں میں سنائی پڑتی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی کمسن پہاڑی دوشیزہ دلفریب وادیوں میں نغمہ ریز ہو اور اس کے گلے میں گھنگھرو بندھے ہوں۔ متھرا میں جب بھی کبھی مجھے آفس یا گھر کا کوئی ٹینشن ہو جاتا تو میں ٹیلی فون پر پریتی سے بات کر لیتا۔ اس کی آواز سن کر میرے دماغ پر جیسے ٹھنڈک پڑ جاتی اور سارا تناو کافور ہو جاتا۔ پریتی کی آواز میں اتنا اثر ہو سکتا ہے اس کا تجربہ مجھے زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے دل میں دوریاں مٹانے کی امنگ پیدا ہوئی۔ اتنا تو معلوم ہی تھا کہ ہم دونوں صرف دوست بن کر رہ سکتے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ میری شادی ہو چکی تھی اور پانچ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ پریتی کے بارے میں زیادہ جانکاری نہیں تھی۔ مس تھی یا مسز؟ میں نے کبھی پوچھنے کی جسارت نہیں کی۔ بہر حال ایک دوسرے سے دوستی کرنا کوئی بری بات تو تھی نہیں۔ میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ کیا ضروری ہے کہ عورت اور مرد کا رشتہ صرف سات پھیروں یا راکھی کے دھاگوں ہی سے بندھ جائے۔ دوستی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھ کر دکھ سکھ کی باتیں کرنا، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا، اور پھر ایک دوسرے کو غموں کے دلدل سے نکالنے کی کوشش کرنا، یہ کیا کم ہے۔ کیا یہ سب زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں نے اسی تصور کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر لیا۔

دوسرے روز آفس پہنچتے ہی میں نے پریتی سے ٹیلی فون پر بات کر لی اور لنچ ٹائم پر ناولٹی ہوٹل میں میرے ساتھ لنچ کرنے کی دعوت دی۔ اتفاق سے اس کی ڈیوٹی بھی ایک بجے ختم ہو رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو نام سے تو جانتے تھے لیکن کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ احتیاطاً میں نے پریتی کو ہدایت دی کہ میں ہلکی نیلی شرٹ پہن کر آؤں گا۔ جواب میں اس نے بھی کہا وہ جامنی رنگ کی ساڑی پہن کر آئے گی۔

میں آفس سے جلدی نکل پڑا۔ گھر پہنچا، وردی بدل کر نیلی شرٹ اور کالی پینٹ پہن لی اور ٹھیک دو بجے ہوٹل پہنچ گیا۔ وہاں اکثر و بیشتر میزوں کے ارد گرد لوگ بیٹھے طعام نوش فرما رہے تھے۔ البتہ کچھ میزیں ابھی بھی خالی تھیں۔ ایک کرسی کھینچ کر میں بھی بیٹھ گیا اور پریتی کا انتظار کرنے لگا۔

سامنے دروازے سے ایک عورت جامنی ساڑی زیب تن کیے ہوئے ہال کے اندر آئی۔

فربہ بدن، کاندھوں تک لہرائے ہوئے ادھ ترشے بال جن کی سفیدی کو گودریج ڈائی سے مسخ کیا گیا تھا، لوکٹ بلاوز جس میں بھاری بھرکم چھاتیاں پھٹ پڑنے کو بے قرار ہورہی تھیں اور ہاتھ میں بھورا چرمی بیگ۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، ایک دو بار مجھے بھی دیکھ لیا، پھر نظر پھیر کر دوسری جانب مڑ گئی۔ دونوں عجیب وسوسوں میں گرفتار ہو گئے۔ اس نے دوسری میز کی طرف رخ کیا اور جا کر وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ پریتی ہی ہے۔ یا کوئی اور۔ اسی دوران بیرا دو بار میرے پاس آرڈر لینے کے لیے آیا مگر میں نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔

بہر حال میں نے ہمت سے کام لے کر پیش قدمی کی اور اس کی میز کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ہچکچاتے ہوئے میں نے مودبانہ انداز میں اسے پوچھا۔ ''آپ......آپ پریتی تو نہیں ہیں؟''

''یس''۔ اس کے چہرے پر استعجاب کی بے شمار لکیریں نمودار ہو گئیں''۔

''آپ کرنل لیش راج ہیں؟''

''جی ہاں، میں کرنل لیش راج ہوں۔'' میں اس کے سامنے خالی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کا غور سے جائزہ لینے لگا۔

آپ تو بہت ینگ لگتے ہیں!'' اس سے رہا نہ گیا۔ وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی اور دھیرے دھیرے پانی کے گھونٹ پیئے جا رہی تھی۔

مجھے اس کی کیفیت کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ میں بھی کرنل اوم پرکاش کی مانند پچاس پچپن کا ہوں گا۔

''تم کو کیا لگ رہا ہے۔ میری عمر کتنی ہوگی؟''

''سر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ کرنل اوم پرکاش چار سال پہلے یہاں آئے تھے اور یہیں سے اب ریٹائر ہو کر چلے گئے۔ وہ تو اکیلے ہی میس میں رہتے تھے۔ ان کی فیملی دہلی میں رہتی تھی۔ دو لڑکے شادی شدہ تھے اور ایک لڑکی باقی بچی تھی۔ سٹر ڈے سنڈے کو دہلی جایا کرتے تھے۔ ان چار سالوں میں صرف دو بار ان کی مسز یہاں آئی تھی۔ میں ان کی مسز سے مل چکی ہوں۔''

''میری تو بیوی ساتھ میں ہے اور ایک لڑکا بھی ہے پانچ برس کا۔''

''مطلب یہ کہ آپ نے بہت دیر سے شادی کر لی ہے۔''

''نہیں تو......ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟''

''آپ کی عمر کتنی ہو گی؟''

''تم ہی اندازہ لگاؤ۔ دیکھتے ہیں تمہارا گیس ورک صحیح ہے یا نہیں۔''

وہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ طے نہیں کر پا رہی تھی۔ بیرے نے اتنی دیر میں میرے آرڈر کے مطابق سلاد کی پلیٹ، سالن کی کشتیاں اور روٹیوں کی ڈلیا سامنے میز پر رکھ دیں۔ پھر ہم دونوں کو گھورنے لگا۔ اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکان تھی۔ شاید وہ بھی اس معمے کو اندر ہی اندر حل کر رہا تھا کہ ہم دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ جب اسے احساس ہوا کہ اس کی چوری پکڑی گئی تو ہڑبڑاہٹ میں بول اٹھا۔ ''سر اور کچھ چاہیے؟''

''نو تھینکس'' میں نے جواب دیا اور پھر پریتی کی طرف مڑ کر بولا۔ کیوں ابھی تک اندازہ نہیں لگا پائیں۔''

اس نے کرنل اوم پرکاش کی عمر اور میری ظاہری عمر کی اوسط نکال کر جواب دیا۔

''سر، میرے خیال میں پینتالیس سے پچاس کے درمیان ہو گی۔'' اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ جو بول رہی ہے اسے خود بھی اس پر یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''تمہارا اندازہ غلط ہے۔ میری عمر صرف پینتیس سال کی ہے۔''

''صرف پینتیس سال......!'' وہ حیرت انگیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی اور پھر دم لے کر گویا ہوئی۔ ''سر، میرا بڑا بیٹا بھی اسی عمر کا ہے۔ وہ پچھلے مہینے پینتیس سال کا ہو چکا ہے۔ اس سے چھوٹے دو اور بچے ہیں۔ ایک بیٹی ہے جو اس سے دو سال چھوٹی ہے اور ایک بیٹا ہے جو اس سے پانچ سال چھوٹا ہے۔''

اس کی باتیں سن کر میں خود پر قابو نہیں رکھ پایا۔ یک بہ یک ہنسی چھوٹ گئی۔ ممکن تھا کہ میرے منہ سے کھانا اگل پڑتا اور سارے میز پر بکھر جاتا لیکن میں نے احتیاط کے طور پر نیپکن سے اپنا منہ ڈھانک لیا۔ پھر کھانا نگل کر اس کے اوپر پانی پی لیا۔

''بات یوں ہے کہ ہم لوگ ڈاک محکمے سے فوج میں ڈیپوٹیشن پر آتے ہیں۔ آرمی پوسٹل سروس میں دو طرح کے افسر ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو انڈین پوسٹل سروس سے براہ راست چلے آتے ہیں اور میری طرح جوان ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو ڈاک محکمے میں کلرک ہوتے ہیں

اور فوج میں بھرتی ہو کر تدریجی منزلوں سے گزرتے ہیں ۔تب کہیں جا کر افسر بن جاتے ہیں۔ جیسے کرنل اوم پر کاش۔'' میری بات سن کر پریتی کو اطمینان ہوا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور پھر کھانے میں مشغول ہو گئی۔لنچ کے دوران ہم نے اور بھی بہت ساری باتیں کیں اور پھر دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔

جب میں گھر واپس جا رہا تھا تو اپنی حماقت پر ہنسی آ رہی تھی ۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ میں بھی کیسا پاگل ہوں۔ کیا کیا خاکے بنائے تھے اس حسن خوش گلو کے......سوچتا تھا اگر وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹی نکلی تو پھر اس دوستی کا کیا ہوگا۔ اور اب جو ہوا وہ تو میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میرا اسکوٹر ہوا سے باتیں کرتا ہوا چلا جا رہا تھا جبکہ میرے دل میں اب بھی گدگدی سی ہو رہی تھی۔

دوسرے روز دفتر پہنچتے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف وہی سحر انگیز آواز تھی مگر آج ٹیلی فون کا رسیور بھاری بھاری سا لگ رہا تھا۔

●□●

# حرصِ گناہ

جب وہ میرے کمرے میں آیا تو بہت غصے میں تھا۔اس کا بس چلتا سارے آفس کو آگ لگا دیتا۔اس نے بچت بنک کے تین پاس بک میری میز پر پھینک دیے اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

''یہ دیکھیے تین پاس بک۔ایک سیونگ بنک اور دو ریکرنگ ڈیپازٹ اسکیم کے۔دولاکھ روپے ان کھاتوں میں جمع ہیں۔میں اور میرے بچے یہاں بھوک سے مر رہے ہیں۔انہیں ٹرانسفر کروانے کے لیے میں نے چار مہینے پہلے گاندھی نگر ہیڈ آفس میں درخواست دے رکھی ہے مگر آپ کا آفس کوئی کارروائی نہیں کرتا۔ہر بار کہتے ہیں کہ ابھی ٹرانسفر ہو کر نہیں آئے،آپ دوچار دن کے بعد پتا لگاؤ۔''

غصے اور تھکاوٹ کے باعث اس کی باچھوں سے سفید جھاگ امنڈ رہی تھی۔''آپ بیٹھ جائیے۔سب کام ہو جائے گا۔''میں نے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس کو تسلی دی۔

''خاک کام ہو جائے گا۔چار مہینوں سے میں لگاتار گاندھی نگر ہیڈ آفس کے چکر لگا رہا ہوں۔کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

''آپ بیٹھ تو جائیے۔ہفتہ بھر میں کام ہو جائے گا۔آپ پریشان نہ ہوں۔''

''پریشان ہونے کی ہی بات ہے۔رات کے اندھیرے میں ہم لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگ آئے۔سارا مال و متاع وہیں چھوڑنا پڑا۔سوچا تھا دوچار مہینوں میں واپس چلے جائیں گے۔وہاں تو روز بروز معاملہ بگڑتا ہی جا رہا ہے۔ہم لوگ کیسے جی رہے ہیں،ہم ہی جانتے ہیں۔اب ان کھاتوں کا تھوڑا بہت سہارا ہے اس میں بھی رکاوٹیں آ رہی ہیں۔''

چند ساعتوں کے بعد چپراسی نے ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔اس نے اپنے ماتھے کے پسینے پونچھ کر سارا پانی ایک ہی گھونٹ میں پی لیا جیسے برسوں کی پیاس بجھا رہا ہو۔اس کے بعد وہ مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوا۔

’’ہے بھگوان، اپنے ہی ملک میں ہم رفیوجی بن گئے ہیں۔ اپنے ہی ملک میں......! آزادی سے پہلے اس ملک کے ساتھ کیا کیا امیدیں وابستہ کی تھیں۔ ایسا وہم وگماں بھی نہ تھا کہ یہ دن بھی دیکھنے پڑیں گے۔‘‘

میں اس کے درد کو سمجھ رہا تھا کیونکہ میں اس سے جدا نہ تھا یا یوں کہیے میری کہانی اس سے مختلف نہ تھی۔ ایک جُگ کا انت ہو چکا تھا، ایک کلچر کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ہم دونوں اس کلچر کے اراکین تھے۔

’’آپ اطمینان رکھیے۔ اب کی بار زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اگر پہلے یہاں آئے ہوتے تو آپ کا کام کب کا ہو چکا ہوتا۔‘‘ میں نے پھر ایک بار اس کو تسلی دی۔

’’ارے صاحب، سب لوگ جھوٹی تسلیاں دیتے ہیں۔‘‘ اس کو میری باتوں پر وشواس ہی نہیں آرہا تھا۔ ’’ہماری حالت تو بھیک منگوں جیسی ہوگئی ہے۔ ہر جگہ دھتکارے جاتے ہیں۔ آفس جاؤ تو وہاں ٹکا سا جواب ملتا ہے کہ ابھی آپ کے ایڈجسٹ منٹ کے آرڈر نہیں آئے ہیں اس لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ ریلیف کمشنر کے پاس جاؤ تو وہ کہتے ہیں، آپ نوکری پیشہ ہیں اس لیے ریلیف کے حقدار نہیں ہیں۔ بنک میں جاؤ تو وہاں بھی ہمارے کھاتے ٹرانسفر نہیں ہوتے۔ ڈاکخانے کا تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے ہم جائیں تو کہاں جائیں۔ پچھلے چھ مہینوں سے نہ کوئی تنخواہ مل رہی ہے اور نہ ہی ریلیف‘‘۔

میں نے بارہمولہ ہیڈ پوسٹ ماسٹر سے ٹیلی فون پر بات کی، کھاتوں کے نمبر نوٹ کروائے اور ساتھ ہی اس کو ہدایت دی کہ سبھی کھاتے دو تین روز میں بہر صورت گاندھی نگر ہیڈ آفس ٹرانسفر ہونے چاہئیں۔ احتیاطاً میں نے مزید تین ٹرانسفر فارم منگوائے اور ان کو خود ہی بھرنے لگا۔ فارم بھرنے کے دوران میں نے اس سے کئی سوال پوچھے۔

’’کیا میں آپ کا پورا نام جان سکتا ہوں؟‘‘

’’میرا نام پیارے لال تکو ہے‘‘ اس نے تھکا سا جواب دیا جیسے ہجرت کرنے کے بعد اب وہ نام ہی بے معنی ہو چکا ہو اور اس نے راستے ہی میں کہیں اپنی شناخت کھوئی ہو۔

’’بارہمولہ میں آپ کا ایڈریس؟‘‘

’’159، خواجہ باغ کالونی، بارہمولہ۔‘‘

''یہاں آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''معرفت شیومندر دھرم شالہ، شاستری نگر، جموں۔''

میں نے مزید اندراجات پاس بکوں کو دیکھ کر کیے، پھر فارموں میں اکاؤنٹ نمبر بھر دیے اور آخر میں پیارے لال کے دستخط ان پر کروا دیے۔ تینوں پاس بکوں کی زیراکس کاپی کروائی اور سبھی کاغذات از سر نو بارہمولہ پوسٹ ماسٹر کے نام بھجوا دیے۔ اس دوران میں نے ضمناً کچھ اور سوال کیے۔

''پیارے لال جی، آپ کہاں نوکری کرتے تھے؟

''پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں''۔

''گھر میں اور کون ہے؟''

''بس میری بیوی اور دو بچے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔''

''مندر میں رہنے سے تو بہت پریشانی ہو رہی ہوگی اور وہ بھی اس گرمی میں؟''

''ارے صاحب۔ پوچھیے مت، زندگی اجیرن ہو چکی ہے۔''

دریں اثنا ہم دونوں چائے پیتے رہے اور ساتھ ہی گفتگو بھی جاری رہی۔

''بارہمولہ میں کچھ جائیداد تو ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں صاحب! خواجہ باغ کالونی میں تین منزلہ دو مکان تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ آتنک وادیوں نے دونوں مکان جلا کر خاکستر کر دیے ہیں۔ اس خبر کی ابھی تک تصدیق نہیں ہوئی۔'' پیارے لال نے رنجیدہ خاطر ہو کر جواب دیا''۔

''دو مکان......!'' میرے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ اُبل پڑے۔ میرے لہجے میں استفسار سے زیادہ استعجاب کا دخل تھا لیکن وہ اس طنز کو نہیں سمجھ پایا۔

''ہاں صاحب، دو مکان تھے۔ ایک میں خود رہتا تھا اور دوسرا بیٹی کے لیے بنوایا تھا۔ سوچا تھا اپنا والا تو بیٹے کو وراثت میں مل جائے گا جبکہ دوسرا بیٹی کو جہیز میں دوں گا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے سماج میں جہیز کی بدعت کس قدر بڑھ چکی ہے۔ بیٹی کو اچھے گھر میں بھیجنا تو اب صرف روپیوں کا کھیل بن چکا ہے۔'' جذبات کی رو میں بہہ کر پیارے لال کے لہجے میں شدت سی پیدا ہو گئی۔

''یہ بات تو صحیح ہے ۔ ہمارا سماج آئے دن ہم پر نت نئے بوجھ ڈال رہا ہے۔ مگر تکو صاحب، یہ سماج ہم سے الگ کوئی چیز تو نہیں ہے۔ آپ...... میں......ہم سب ہی تو سماج بناتے ہیں۔ یہ بدعتیں پیدا کرنے کے ذمہ دار تو ہم ہی ہیں۔''

''کوئی اکیلا اس کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے۔ رسم ورواج کے حصاروں کو توڑنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''ہے، مگر ہم کوشش نہیں کرتے۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ آپ کے والدین کہاں ہیں؟''

''دونوں بہت عرصہ پہلے سورگباش ہو چکے ہیں۔ میرے پتا جی گورنمنٹ ہائی اسکول بارہمولہ میں استاد تھے۔''

''بہت دور اندیش رہے ہوں گے آپ کے پتا جی۔ اتنی پراپرٹی چھوڑ گئے۔ ورنہ پرانے زمانے تو لوگ آگے کی سوچتے ہی نہیں تھے۔''

''کون......! پتا جی......!'' اس نے قہقہہ لگا کر کہا ''کیوں مذاق کرتے ہیں آپ۔ بھلا ایک ادنیٰ اسکول ٹیچر اتنی ساری پراپرٹی کہاں سے بنا سکتا تھا۔ یہ سب میرے اپنے خون پسینے کی کمائی ہے صاحب۔'' اس کے لہجے میں جارحیت کا عنصر بھی شامل تھا۔

''خون پسینے کی کمائی یا پھر......؟'' میں نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھ گیا۔ آخر اسٹیٹ پی ڈبلیو ڈی کا اوورسیئر جو تھا۔ کیوں نہ سمجھتا۔

وہ لاجواب ہو گیا اور اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بہر حال اس کی خاموشی ہی میرے سوال کا جواب تھی۔

مجھے اپنے بھونڈے سوال پر ندامت سی محسوس ہوئی مگر کیا کرتا۔ کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ میں نے اپنی گفتگو کا رخ ہی بدل دیا۔

''بچے کتنے بڑے ہیں؟''

''لڑکی بارہویں میں پڑھ رہی ہے اور لڑکا دسویں میں۔ اس سال دونوں کے بورڈ امتحانات ہیں۔''

''بھگوان دونوں کو کامیاب کرے۔'' میں نے دعا کی۔

اتنی دیر میں چپراسی ٹرانسفر فارموں کی رسیدیں لے کر آ گیا اور میں نے رسیدیں اور پاس بک پیارے لال کے حوالے کر دیے۔ رسیدیں جیب میں رکھتے ہوئے اس نے مجھ سے پھر پوچھا۔

''تو پھر میں کب آؤں؟''

''آپ اگلے سوموار کو آیئے، تب تک آپ کا کام ہو جائے گا۔''

امید اور ناامیدی کے درمیان جھولتا ہوا وہ بھاری قدموں سے میرے آفس سے باہر نکلا۔ اس کا غصہ واجب تھا لیکن ڈاک خانے کی بھی کئی مجبوریاں تھیں۔ ادھر وادی کے حالات بگڑتے جا رہے تھے۔ سارا کام کاج ٹھپ ہو چکا تھا۔ آئے دن بم پھٹنے، ہتھ گولے پھینکنے اور گولیاں چلنے کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ کرفیو لگاتار نافذ کیا جا رہا تھا۔ بازار بند، بنک بند، ڈاک خانے بند یعنی سب کچھ معطل ہو چکا تھا۔ ایسے حالات میں دفتر کھولنا یا پھر اسٹاف کو دفتر آنے پر مجبور کرنا ممکن نہ تھا۔ کرفیو میں ایک دو گھنٹے ڈھیل مل جاتی تھی تو لوگ بھاگے دوڑے سودا سلف خرید کر اپنے گھروں میں چھپ جاتے۔ اس کے باوجود کچھ لوگ جوں توں کر کے آفس پہنچ جاتے اور تھوڑا بہت کام نپٹا لیتے تھے۔

ادھر پیارے لال تکو جیسے ہزاروں لوگ اس انتظار میں تھے کہ آج نہ کل ان کے کھاتے ٹرانسفر ہو کر آئیں گے۔ انہوں نے اپنے خون پسینے کی کمائی آڑے وقت کام آنے کے لیے بچا کر رکھ لی تھی اور اب یہی ان کا واحد سہارا تھی۔ بارہمولہ ڈاک خانہ اور وہاں کا اسٹاف میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ پھر بچپن کے وہ دن یاد آ گئے جب میں بارہمولہ میں اپنے ننھیال میں رہتا تھا۔ جہلم کا وہ بہتا ہوا پانی، دریا کے اوپر دو پل۔ ایک پرانا اور دوسرا نیا، پانی ایسی تیزی کے ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا جیسے سرحد پار کرنے کی جلدی میں ہو۔ پس منظر میں نیلے اودے پہاڑوں کا سلسلہ تھا اور کناروں پر پرانی وضع کی بے شمار عمارتیں کھڑی تھیں۔ صدر بازار کی وہ گہما گہمی، بس اڈے کا وہ شور و غل اور تانگے والوں کی وہ مسلسل آوازیں مجھے ابھی بھی یاد آ رہی تھیں۔ قصبے میں داخل ہوتے ہی چونگی موڑ سے خوبصورت کنٹونمنٹ شروع ہوتا تھا۔ آگے جا کر تھوڑی دوری پر چرچ اور سینٹ میریز کانونٹ تھے جہاں خوش لباس اور خندہ رو بچوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف آرمی کے آفس اور رہائشی مکان تھے۔ دو سنیما گھر تھے جن میں سے ایک فوجی تھا اور دوسرا سیویلین۔ فلم اچھا ہوتا تو فلم دیکھنے

والوں کی قطاریں سڑک تک پھیل جاتیں۔ ہر سو قناعت، سکون اور بشاشت نظر آتی تھی۔

بدلے ہوئے حالات میں کیا ہوا ہوگا، اس کے بارے میں میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اتنا ضرور سننے میں آیا ہے کہ چاروں جانب دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ آدمی ہتھیلی پر جان لیے پھرتا ہے۔ سڑکوں پر موت کے سایے منڈلاتے ہیں۔ راہزنوں کے ہاتھوں میں بھی بندوقیں ہیں اور راہبروں کے ہاتھوں میں بھی۔ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہو چکی ہیں۔ خوش رنگ سپنوں کی جگہ ڈراونے خوابوں نے لے رکھی ہے۔ بیشتر لوگ اختلالِ حواس میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

چار دنوں کے بعد پیارے لال کے کھاتے ٹرانسفر ہو کر آگئے۔ سوموار کو حسب وعدہ پیارے لال میرے سامنے فریادی کی طرح کھڑا ہو گیا۔ وہ جب پہلی بار میرے پاس آیا تھا تو پیاس سے تڑپ رہا تھا مگر آج پیاس کی شدت قدرے کم تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اسکی پیاس موسم کی گرمی کی وجہ سے کم اور اندر کی تپش سے زیادہ تھی۔ وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے کھاتوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مسکراتے ہوئے میں نے اسے کھاتوں کے ٹرانسفر ہونے کی اطلاع دی۔ دریں اثنا چپراسی نے ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کیا اور اس کے بعد میرے کہنے پر چپراسی چائے لانے کے لیے باہر چلا گیا۔ کمرے میں بس پیارے لال اور میں رہ گئے۔

اس نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر کمرے کا بغور جائزہ لیا اور پھر رازدارانہ لہجے میں گویا ہوا۔

"آپ کو معلوم ہے آج کل وادی میں کیا ہو رہا ہے؟"

"کس بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"ارے صاحب وہی دہشت گردوں کے بارے میں۔ سننے میں آیا ہے کہ سیکورٹی فورسز کے افسر دو دو لاکھ روپے لے کر دہشت گردوں کو چھوڑ رہے ہیں۔ آج کل وادی میں پوسٹنگ لینے کے لیے افسروں کی ہوڑ لگی ہوئی ہے۔"

مجھے اس بات پر بالکل یقین نہیں آیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ دشمنوں کا چھوڑا ہوا شوشہ ہے تا کہ ہمارے سیکورٹی فورسز کا منوبل گر جائے۔ ایسی افواہیں ہر روز پھیلائی جا رہی تھیں۔ بہر حال میرے پاس پیارے لال کو جھٹلانے کے لیے اس وقت کوئی ثبوت نہ تھا۔ اس لیے منطقی دلائل

سے اس کو سمجھانا پڑا۔ دیکھا جائے تو اس کی باتوں میں بھی کافی دم تھا۔ وادی میں دہشت گردی بڑھتی چلی جارہی تھی۔ دو آتنک وادی پکڑے جاتے تو چار نئے پیدا ہو جاتے تھے۔ ایک تنظیم کا سرغنہ مارا جاتا، دو تنظیمیں اس کا بدلہ لینے کے لیے میدان میں کود پڑتی تھیں۔ تاہم میں نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''پیارے لال جی، ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔ کبھی بھی نہیں ہوسکتا ہے۔''

''کیوں نہیں ہوسکتا ہے؟'' وہ زخمی چیتے کی طرح بھر کر بول اٹھا۔ ''آخر سرحد پار سے اتنا سارا اسلحہ کیسے درآمد ہوا۔ کیا سرحدوں پر بارڈر سیکورٹی کے جوان تعینات نہیں ہوتے۔ وہ انہیں کیوں نہیں روک لیتے ہیں۔''

''آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری سرحد نہ صرف شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہے بلکہ بینڈھی ہوئی ہے۔ اتنی لمبی چھلنی جیسی سرحد کی نگہبانی کرنا موجودہ وسائل سے ممکن نہیں ہے خاص کر جب سرحد ایسی ہو جس میں کہیں کوئی قدرتی فصیل بھی نہ ہو۔''

''ایسا نہیں ہے صاحب۔ آپ مانیں یا نہ مانیں سچ تو یہ ہے کہ اب بے ایمانی وردی میں بھی سرایت کرچکی ہے۔''

''فرض کرلیں آپ کی بات ہی صحیح ہو پھر اس میں غلط ہی کیا ہے؟''

''کیوں! غلط کیوں نہیں ہے۔ یہ تو کھلے عام لوٹ ہے۔ قوم کے ساتھ دھوکا ہے۔ ذرا سوچیے تو چند روپیوں کی لالچ میں ہمارے ہزاروں سالوں کا کلچر صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو چکا ہے۔''

''پیارے لال جی، آپ اس کو اقتصادی زاویے سے کیوں نہیں دیکھتے۔ جنگ اور دہشت گردی ہی ایسے مواقع فراہم کرتے ہیں جن میں یہ لوگ کمائی کر سکتے ہیں۔ امن کے دنوں میں تو آپ ان کو کچھ دینے سے رہے۔ پھر یہ موقع وہ کیوں گنوائیں۔ آخر ان کے گھر میں بھی بال بچے ہیں۔ ان کو بھی اپنی بیٹیوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ ان کے لیے بھی جہیز کی ضرورت ہے۔ خود ان کو ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی سوشل سیکورٹی کی فکر بھی کرنی ہے۔ ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ سماج میں صرف ایک چھوٹے سے طبقہ پر اصول لاگو ہوں اور باقی سب عیش کرتے پھریں۔ معاشرے میں جب گھن لگتی ہے تو وہ چھوٹے بڑے سبھی پیڑوں پر حملہ کرتی ہے وہ ایک دوسرے کے بیچ کوئی بھید بھاؤ

نہیں کرتی۔"

پیارے لال کے ذہن میں ہلچل سی مچ گئی۔وہ میرے طنز کے تیروں کا مطلب سمجھ گیا۔کچھ بھی جواب نہ دے پایا۔بس چپ چاپ دیکھتا رہا۔

میری میز پر اسی روز کا 'کشمیر ٹائمز' پڑا ہوا تھا۔میں نے اخبار ہاتھ میں اٹھا کر پیارے لال کے سامنے رکھ دیا۔اس کا فرنٹ پیج دل دہلانے والی تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔پہلی تصویر چلڈرن ہسپتال کی اس عمارت کی تھی جو انجینئروں کی بے توجہی کی وجہ سے ایک روز پہلے ڈھ چکی تھی۔دوسری تصویر دو معصوم بچوں کی تھی جو چھت گرنے کی سبب ابد کی نیند سو چکے تھے۔تیسری تصویر اس آپریشن تھیٹر کی تھی جہاں ایک بچہ زندگی کی امیدیں لے کر داخل ہوا تھا مگر بلڈنگ گرنے کے باعث موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔چوتھی تصویر اس نرس کی تھی جس کے بازو پر سیمنٹ کا سلیب گر چکا تھا۔نتیجتاً اس کا بازو ہی کاٹنا پڑا تھا۔ان سب تصویروں کے نیچے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "چلڈرن ہسپتال کی ناقص عمارت گری۔بیس معصوم بچے جان بحق۔"

یہ کام کسی دہشت گرد کا نہیں تھا۔کسی سیکورٹی فورس کے افسر کا بھی نہیں تھا۔یہ کام قوم کے معماروں کا تھا۔پی ڈبلیوڈی کے انجینئروں اور اوورسیئروں کا تھا۔جنہوں نے لاکھوں روپے کھا کر ایسی غیر معیاری عمارت تعمیر کروائی تھی۔

کمرے میں میرے سامنے دیوار پر ایک کلینڈر لٹک رہا تھا جس پر دو خوشدل نونہالوں کی تصویریں چھپی تھیں اور ان کے نیچے سرخی میں لکھا تھا۔"بچے قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔"

میری نگاہیں کلینڈر اور پیارے لال کے درمیان جھولتی رہ گئیں۔پیارے لال بھی کیلنڈر کی جانب متوجہ ہوا۔عبارت پڑھ کر اس کا چہرہ اتر گیا۔اب وہ میری آنکھوں سے آنکھیں ملانے سے کترا رہا تھا۔

اس دوران چپراسی نے پیارے لال کو وہ خط لا کر دے دیا جس میں اس بات کی تصدیق کی گئی تھی کہ اس کے کھاتے گاندھی نگر میں کھل گئے ہیں۔

میں نے سوچا تھا یہ خط پا کر پیارے لال بہت خوش ہو جائے گا مگر وہ پھر بھی یاسیت کا مجسمہ بنا رہا۔دبے الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ دھیرے دھیرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

●□●

# موت کے سوداگر

''کیوں، درد ہو رہا ہے؟ آپ کو؟''۔

''جی ہاں، شدید درد ہو رہا ہے۔''

''کہاں پر......؟''

''سینے میں......(مخصوص جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہاں پر۔''

''وہاں تو دل ہوتا ہے۔ شاید آپ دل کے مریض ہیں۔''

''ڈاکٹر نے کچھ ایسا ہی کہا تھا (بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پہلے آپ مجھے اس بیگ میں سے دوائی نکال کر دیں۔''

''اتنی چھوٹی سے عمر میں آپ کو دل کی بیماری کیسے لگی؟ عام طور پر یہ بیماری پچاس سال کے بعد ہی لگتی ہے۔''

''بیماری کا کیا۔ کب لگ جائے کسے معلوم۔ یہ بیماری اکثر حساس اور فکر مند انسانوں کو جکڑ لیتی ہے۔ باقی لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب پیدا ہوئے، کتنی دیر جیے اور کب مرنے کا وقت آ پہنچا۔ اندھوں کی مانند لاٹھی ٹیکتے ہوئے زندگی کا سفر تمام کرتے ہیں۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں۔ خیر آپ دوائی کھا لیجیے۔ آپ کے چہرے سے لگ رہا ہے کہ آپ بہت تکلیف میں ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔''

''نہیں نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ درد تو اٹھتا ہی رہتا ہے۔ اب دوائی کھا لی ہے۔ تھوڑی دیر میں آرام ہو جائے گا۔''

''لگ رہا ہے کوئی بہت اچھی دوائی ہے۔''

''دوائی کا کیا۔ جو مارکیٹ میں چل رہی ہو وہی کھانی پڑتی ہے چاہے اچھی ہو یا بری۔ چاہے اس میں ایسے عناصر ہی کیوں نہ ہوں جو بدن کے دوسرے حصوں کے لیے

ضرررساں ہوں۔ ہمارے ملک میں ان پر کوئی روک ٹوک بھی تو نہیں۔ مغربی ممالک میں جو دوائیاں بہت برس پہلے ممنوع قرار دی گئیں وہ ابھی بھی اس ملک میں چل رہی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ امریکہ میں بیس سال پہلے میکسا فارم اور انٹیرو وائیوفارم پر پابندی لگ چکی تھی جبکہ یہاں ان دوائیوں پر حال ہی میں پابندی لگائی گئی۔''

''آپ صحیح فرما رہے ہیں۔کئی ملٹی نیشنل کمپنیاں تیسری دنیا کو اپنی لیبارٹری سمجھ رہی ہیں۔ یہاں کے معصوم مریضوں پر اپنی نئی دوائیوں کے ٹیسٹ کر لیتی ہیں۔ بہت سارے معاملے ایسے بھی سامنے آئے ہیں جہاں مریض کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس پر نئی دوائی کا ٹیسٹ کیا جارہا ہے۔ہم لوگ تو گنی پگس بن کر رہ گئے ہیں۔''

''ایک زمانہ تھا۔خطرناک بیماریوں کے لیے صرف پینسلین کارگر ہوتی تھی۔اب تو بیماریاں بھی پیچیدہ ہوگئی ہیں اور دوائیاں بھی۔ ہر سال نت نئے اینٹی بیوٹک ایجاد ہوتے ہیں۔ سپروفلاکسن، نارفلاکسن، اور نہ جانے کیا کیا۔''

''ارے صاحب۔ سپروفلاکسن بہت ہی کارآمد اینٹی بیوٹک ثابت ہوا ہے''۔

''وہ کیسے؟''

''حال ہی میں امریکا میں انتھریکس کے توڑ کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ورنہ یہ وبا ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی۔''

''وباؤں کا کیا جب پھیلتی ہیں لاشوں کے ڈھیر لگاتی ہیں۔انتھریکس تو انسانی کارستانی تھی۔انسانیت نے ہمیشہ مٹھی بھر لوگوں کی من مانی کا خمیازہ اٹھایا ہے۔حیرت تو اس بات کی ہے کہ ان سرپھرے لوگوں نے کروڑوں لوگوں کو سحرزدہ کر دیا ہے۔تواریخ میں ایسے سرپھرے لوگوں کی کوئی کمی نہیں۔ دیکھا جائے تو قدرت بھی کچھ کم نہیں۔ ادھر جنوب مشرقی ایشیا میں ایوین فلو نے سر ابھارا ہے۔''

''ہاں۔ یہ وبا تو پھیلتی ہی چلی جارہی ہے۔ ہزاروں مرغیاں ذبح کر لی گئیں۔پھر بھی کنٹرول نہیں ہوتی۔''

''بے چاری مرغیاں! انسان کی خاطر انہیں جینے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ انسان بھی کتنا سنگ دل اور خودغرض جانور ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے کسی کو بھی ذبح کرنے کے لیے کمر کس

لیتا ہے۔نہ جانے کس نے ان کو مارنے کا فتویٰ دیا ہوگا۔ان کے لیے ٹیکہ بھی تو بنایا جاسکتا تھا۔''

''مرغیوں کی خاطر ٹیکے کی کھوج کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔اس سے کہیں بہتر یہی ہے کہ متاثر ہوئے علاقے کی سبھی مرغیوں کو نیست و نابود کردیا جائے۔نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔اس طرح وبا سے بھی چھٹکارا پایا جاسکتا ہے۔''

''مرغیوں کا کوئی غم نہیں۔پھر سے پولٹری فارم میں ہزاروں پیدا ہوسکتی ہیں۔آخر اشرف المخلوقات کو تو بچانا ضروری ہے۔''

ہزاروں سالوں سے انسان کو بچانے کی ہی تدبیریں ہورہی ہیں۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں۔انسان کو بچانے کی تدبیریں صدیوں سے کی جارہی ہیں پھر بھی انسان بچ نہیں پاتا۔''

''جب زندگی نئے وسیلے ڈھونڈتی ہے تو موت بھی نئے طریقے ڈھونڈ نکالتی ہے۔پھر انسان بے بس ہوجاتا ہے۔ہم نے کتنی ساری بیماریوں کے توڑ نکالے اور سالوں بعد وہی بیماریاں نئے انداز میں سر ابھارنے لگیں۔ملیریا کے لیے ڈی ڈی ٹی ایجاد کیا اب صورت حال یہ ہے کہ ایسے مچھر پیدا ہوئے ہیں جن پر ڈی ڈی ٹی کا اثر ہی نہیں ہوتا۔''

''ہمیں انسان کو بچانے کے لیے اپنا ریسرچ تیز تر کرنا ہوگا۔''

''وہ کیوں......؟''

''کیوں کہ وائرسوں کے نئے اسٹرین پیدا ہورہے ہیں جن پر پرانی دوائیاں کارگر نہیں ہوتیں۔اب نئی نئی بیماریاں سر ابھارنے لگی ہیں۔چند سال پہلے ایڈس،ہیپاٹائٹس اور ایوین فلو جیسے ناموں سے کوئی بھی آدمی واقف نہ تھا اور اب دیکھو ہر گھر میں ان بیماریوں کا چرچا ہے۔''

''اُن دنوں ٹی بی،ملیریا،پلیگ یا پھر کینسر ہوا کرتا تھا۔غرض یہ کہ ہم بیماریوں پر جتنا قابو پا رہے ہیں اتنی ہی نئی خطرناک اور مہلک بیماریاں پیدا ہورہی ہیں۔''

''نئی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے لیے بہت سارے سرمایے کی ضرورت پڑے گی۔اور پھر گنی پگس کی بھی۔شاید انسان نما گنی پگس کی بھی ضرورت پڑے۔''

''اقوام متحدہ یہ سب چیزیں مہیا کرواسکتا ہے۔کم از کم ان کاموں کے لیے وہ اپنا رول ادا کرسکتا ہے چاہے امن و شانتی بحال کرنے میں ناکام ہی کیوں نہ رہا ہو۔''

''میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھیے......!''

''آپ مجھے جانتے بھی نہیں۔ پھر مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں......؟''

''جانتا تو نہیں ہوں البتہ آپ کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ آپ میرے کام آسکتے ہیں کیونکہ یہ بیماری اب آپ کو زیادہ دیر جینے نہیں دے گی۔''

''وہ کیسے......؟''

''میں گرُدوں کا سوداگر ہوں۔ چنانچہ آپ کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس لیے آپ اپنا ایک گردہ بیچ کیوں نہیں دیتے۔ ویسے بھی آپ کے چہرے سے غربت اور مفلسی ٹپک رہی ہے۔ اگر آپ اپنا ایک گرُدہ بیچ دیں تو اڑھائی لاکھ مل جائیں گے۔ اس میں سے پچاس ہزار میرا کمیشن اور باقی آپ اپنی فیملی کو دے سکتے ہیں۔ وہ انتہائی خوش ہو جائیں گے۔ اتنی کمائی تو آپ نے عمر بھر بھی نہیں کی ہوگی۔''

''اڑھائی لاکھ......!''

''ہاں، اڑھائی لاکھ۔''

''آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟''

''نہیں اس میں مذاق کی کونسی بات ہے۔ بازار میں گرُدے کی قیمت اڑھائی لاکھ ہے۔ آپ کو نیٹ دو لاکھ مل جائیں گے۔''

''میں نے تو ساری عمر اتنے سارے روپے نہیں دیکھے ہیں۔ (کچھ سوچتا ہے) یہ تو بہت اچھی بزنس ہے۔ مشرقی لوگوں کو چاہیے انسانی اعضاء کے بنک قائم کریں اور مغرب کو بیچیں۔ اس میں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ فٹ پاتھ پر پیدا ہو، فٹ پاتھ پر جیو، فٹ پاتھ پر ہی کھاؤ پیو اور پھر اپنا گردہ بیچو......دو لاکھ......اور اگر آنکھ، کان یا ایسے ہی اعضا کی ڈیمانڈ ہو تو لاکھوں کما سکتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر گھٹ گھٹ کر مرنے سے کیا فائدہ۔ میری تو مراد پوری ہو جائے گی۔ بیٹی کی شادی ہوگی اور بیٹے کے کاروبار کے لیے سرمایہ مل جائے گا۔ میرا کیا آج مرا کل دوسرا دن۔''

''اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ چلو میرے ساتھ۔''

''بھائی صاحب، کہاں لے جاؤ گے؟''

''اسپتال، ڈاکٹر کے پاس......''

''ڈاکٹر......! کیا وہ ایسی گھناونی حرکت کرنے کے لیے تیار ہوگا؟''

''کیوں نہیں۔ڈاکٹروں کے ساتھ ہماری ملی بھگت ہے۔وہی تو اس کاروبار کے سرغنہ ہیں۔''

''ڈاکٹری کو تو نوبل پروفیشن مانا جاتا ہے۔ڈاکٹروں کو موہ مایا کے بغیر لوگوں کی خدمت کرنی چاہیے۔پھر یہ سب......؟''

''آج کی دنیا میں ایسے نصب العین پالنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔جس دنیا میں ڈاکٹری تعلیم میں داخلہ لینے کے لئے پچیس تیس لاکھ کا نذرانہ دینا پڑے اوراس کے اوپر ٹریننگ کے دوران مزید دس لاکھ خرچ کرنے پڑیں، اس دنیا میں آئیڈیل اور آئیڈیلزم کی باتیں کرنا فضول ہے۔بیاج سمیت کل پچاس لاکھ میں ڈاکٹری کی ڈگری مل جاتی ہے۔وہ سب تو وصول کرنا ہی پڑے گا۔''

''اوہ گاڈ......!''

''اب آپ ہی بتایئے۔ایسی حالت میں ڈاکٹر مریض کی شفا کی دعا کرے گا یا بیماری کی۔بیماریاں جتنی پھیل جائیں گی اتنا ہی ڈاکٹروں کو فائدہ ہوگا۔ان کو اپنا سرمایہ اوراس پر لگا بیاج وصول کرنا ہی پڑے گا۔پھر اپنے پروفیشن کو چلانے کے لیے ٹھاٹ باٹ بھی رکھنی پڑے گی۔اس کے لیے بھی خرچہ چاہیے۔جن ڈاکٹروں کی پریکٹس چلتی ہے ان کی تو موج ہے۔جن کی پریکٹس نہیں چلتی وہ گردے بیچتے ہیں۔''

''مجھے آپ کی یہ پیش کش سمجھ میں آ گئی۔اس میں ایک امید کی کرن بھی نظر آ رہی ہے۔''

''وہ کون سی......؟''

''یہی کہ آپ تو اس کاروبار سے واقف ہیں ہی۔اگر مجھے بھی اس کاروبار میں پارٹنر بنا لو تو میں آپ کے لیے بہت بزنس لا سکتا ہوں۔میں دنیا کی سب سے بڑی جھگی جھونپڑی میں رہتا ہوں۔تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی ہوں۔جبکہ وہاں باقی سبھی لوگ ان پڑھ، جاہل اور گنوار ہیں۔جو کوئی پڑھ لکھ لیتا ہے۔وہ اس بستی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر غیر ممالک میں آباد ہو جاتا ہے۔میں تو وہاں اندھوں میں کانا راجہ ہوں۔لوگ مجھ پر بھروسا کرتے ہیں اور مجھ سے مشورہ لیتے

ہیں۔ بھروسا اور وعظ دو ایسے ہتھیار ہیں جن کو استعمال کر کے میں ساری بستی کو بیوقوف بناتا ہوں۔ ابھی تک دوسروں کی خاطر یہ کام کرتا تھا اب اپنے لیے کروں گا۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے مذہبی علماء اور سیاست دان۔

ایک بات اور ہماری بستی کے کئی افراد مڈل ایسٹ اور ساؤتھ ایسٹ ایشیا میں سمگلنگ اور منشیات کا کام کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر ہم انسانی گردوں کا ایکسپورٹ کر سکتے ہیں۔ دھیرے دھیرے باقی اعضا بھی شامل کر لیں گے۔''

''ارے بھئی۔ آپ تو بڑے عقلمند نکلے۔ میں تو کئی سالوں سے سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسی صورت نکلے کہ ہم مغربی ممالک کو گردوں کا ایکسپورٹ کریں۔ بات یہ ہے کہ مغربی ممالک میں بہت امیر اور اعلیٰ ظرف لوگ رہتے ہیں جن کی زندگی کی اتنی قیمت ہوتی ہے جتنی ہم سوچ بھی نہیں سکتے جبکہ مشرقی ممالک میں بے کار، غریب، نادار اور مفلس لوگ رہتے ہیں جن کی زندگی کی کوئی ویلیو نہیں ہوتی۔ پھر اپنے اعضا بیچنے میں ہرج ہی کیا ہے۔''

''یہ قانوناً جرم ہے۔ ہم پکڑے بھی جا سکتے ہیں۔ ہمیں احتیاط سے قدم اٹھانا پڑے گا۔''

''قانون کو کون پوچھتا ہے۔ کیا عصمت فروشی اور منشیات کا کاروبار جرم نہیں ہے؟ کون سا ایسا ملک ہے جہاں عصمت فروشی نہیں ہوتی۔ کئی ملکوں نے تنگ آ کر اب اس کاروبار کو جائز ٹھہرایا ہے۔ ان ملکوں میں عورت کو اپنا حسن اور جسم بیچنے کی پوری چھوٹ ہے۔''

''تو پھر کیا......؟''

''ہاں ایسا وقت بھی آئے گا جب روزگار کے مواقع اتنے کم ہو جائیں گے کہ آدمی اپنے ہی اعضا بیچ کر اپنا پیٹ پالے گا۔ غریب والدین بچے اس لیے پیدا کریں گے تاکہ ان کی بوٹی بوٹی نیلام چڑھا سکیں اور یہ کام زیادہ تر مشرق میں ہوگا جبکہ اس وقت بھی ہمارے یہاں ایسے ثنا خواں ہوں گے جو گزشتہ عظمتوں کے گن گاتے پھریں گے۔''

''مجھے آپ کی اس اسکیم میں کافی دم لگتا ہے۔ میں کل ہی اپنے کزن سے بنکاک میں بات کر لوں گا اور اس اسکیم کا خاکہ تیار کر لوں گا۔ آپ مجھے اپنا موبائل نمبر دیجیے۔''

''یہ میرا وزیٹنگ کارڈ رکھ لیجیے۔ اس میں میرے سبھی ٹیلی فون نمبر درج ہیں۔ جب مناسب سمجھیں فون کر لیں۔''

"تعجب ہے کہ اتنا بڑا مارکیٹ ہونے کے باوجود آج تک کسی کی نظر اس طرف نہیں پڑی۔ جبکہ سبھی لوگ مارکیٹ اکانومی کے دم بھرتے ہیں۔ اوپن مارکیٹ کی قسمیں کھاتے ہیں۔ مجھے تو اس مارکیٹ میں کافی پوٹینشل نظر آرہا ہے۔"

"اچھا اجازت دیجیے۔ اب بہت دیر ہورہی ہے۔ میں آپ کے ٹیلی فون کا انتظار کرونگا۔ شب بخیر۔"

●□●

# دشتِ وحشت

جب وہ امرت کور سے امرت اگروال بنی ،سارے گھر میں ہاہا کار مچا تھا۔ایک تو سردارنی کی ہندو سے شادی اور وہ بھی بنیے کے ساتھ۔ سگے سمبندھی کیا،اس کے سکھ افسر کو بھی یہ بات ناگوار گزری۔ جبھی سے وہ اس کا دشمن بن گیا۔ بڑھاپے میں بھی وہ امرت کور کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔

امرت کور پٹیالہ کے ایک بہت بڑے زمیندار کی چوتھی اور آخری اولاد تھی۔اس سے بڑے تین لڑکے تھے۔بٹوارے کے دوران امرت کے دونوں چاچا، جو لاہور میں نوکری کے سبب اقامت پذیر تھے،اپنے بال بچوں سمیت فرقہ وارانہ فسادات کی بھینٹ چڑھ گئے۔سرحد کے اِس پار کی ساری جائیداد کا مالک اس کا والد بن بیٹھا۔اس طرح ان کے وارے نیارے ہو گئے۔

سرجیت سنگھ نے اپنے بچوں کی پڑھائی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ان کی تعلیم کا انتظام شہر کے بہترین اسکولوں میں کیا۔امرت کور نہ صرف پڑھائی میں امتیازی مقام حاصل کرتی رہی بلکہ ٹینس اور سکواش میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی۔کھیل کود کے سبب اس کا بدن کسرتی ،تنومند اور پھرتیلا بن گیا۔اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا مردانہ پن جھلکنے لگا جو اس کو باقی سہیلیوں سے ممیز کرتا تھا۔

امرت کے دل میں بچپن ہی سے یہ بات گھر کر گئی تھی کہ وہ مردوں کے مقابلے میں رتّی بھر بھی کم پایہ نہیں ہے۔وہ اپنی عمر کے کسی بھی نوجوان کو پچھاڑ سکتی تھی۔ پتا جی نے بھی اسے سر چڑھایا تھا۔ پورے خاندان میں ایک اکیلی وہی لڑکی تھی۔ دور دور تک کہیں کسی چچیری،ممیری یا پھپھیری بہن کا نام و نشان بھی نہ تھا۔شمالی ہند میں عموماً لڑکی کی پیدائش پر والدین مایوس ہو جاتے ہیں اور بھگوان سے ہمیشہ نرینہ اولاد دینے کی دعا کرتے ہیں۔امرت کور اپنے تین بھائیوں کے ساتھ، جو عمر میں اس سے بڑے تھے،مل کر اودھم مچاتی۔اٹھنا، بیٹھنا،کھیلنا کودنا بھائیوں کے سنگ

ہوتا تھا۔ وہ تو لڑکیوں والے کھیل کھیلنے سے رہے۔ مجبوراً امرت کور کو بھی فٹ بال، ہاکی یا ٹینس ہی کھیلنا پڑتا تھا۔ گھر میں جب چاروں ہڑدنگا مچاتے تو دیکھتے ہی بنتی تھی۔ میز، کرسی، تکیے، کُشن، بستے، کتابیں، قلم، پنسل کوئی بھی چیز اپنی مقررہ جگہ پر نہیں ملتی۔ نوکر نوکرانیاں بس تماشائی بنے بیٹھے رہ جاتے۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ زبان کھولے۔ البتہ پتاجی کے آنے کا وقت ہوتا تو سبھی اپنے اپنے کمروں میں دبک جاتے جبکہ نوکر ہر چیز کو جلدی جلدی واپس اپنی جگہ رکھ دیتے۔

امرت کور نے اپنی ماں بچپن ہی میں کھوئی تھی۔ گھر میں نوکر چاکر کی کوئی کمی نہ تھی۔ کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ البتہ ماں کے سینے پر اپنا سر رکھ کر جو راحت محسوس ہوتی ہے، وہ اس سے ناآشنا تھی۔ اس کے بدن میں کب کون سا بدلاؤ آتا رہا یہ راز اپنے باپ یا بھائیوں کے سامنے نہ کھول سکی۔ وہ نوکرانیوں کے ساتھ بھی اس بارے میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ بس اپنی سہیلیوں سے مشورہ کر لیتی اور جیسا وہ کہتیں ویسا کر لیتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے نسائی وجود سے ہمیشہ کڑھتی رہی۔

رفتہ رفتہ امرت کور کو مردانہ طور طریقے لبھانے لگے۔ کسرتی بدن تو تھا ہی، سینے کی وادیاں بھی غائب ہو گئیں۔ بوائز کٹ، جینز اور قمیض زیب تن کیے، دائیں بازوں میں موٹا کڑا اور بائیں ہاتھ میں سگریٹ لیے وہ بے روک ٹوک گھومتی پھرتی۔ شراب پینے کی لت کالج کے دنوں میں ہی پڑ گئی۔ دو چار سہیلیاں جمع ہو جاتیں، ہوسٹل کے بند کمرے میں شراب نوش فرماتیں اور پھر انٹلکچول قسم کی باتیں کر کے خود کو پشکن، گورکی اور چیخوف کی وارث سمجھتیں۔

کوا جب ہنس کی چال چلتا ہے، اپنی چال ہی بھول جاتا ہے۔ امرت کور یہ بھول ہی گئی کہ وہ ایک لڑکی ہے۔ ہوسٹل میں نہ ماں باپ کا ڈر تھا اور نہ ہی بھائی بندھوؤں کا۔ بس اپنی ایک الگ دنیا بسا رکھی تھی اس نے۔ امرت کی مردنما شخصیت سے مغلوب ہو کر کئی سہیلیاں اس کی جانب کھنچی چلی آئیں۔ سریتا تو خیر روم پارٹنر تھی ہی دوسری سہیلیاں بھی اس کی قربت حاصل کرنے کو بے چین رہتیں۔ سریتا اس کی ہر ضرورت پورا کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتی جبکہ دوسری سہیلیاں سریتا سے جل بھن جاتیں۔

ایسی مقناطیسی شخصیت کی جانب لڑکوں کا متوجہ ہونا بھی فطری تھا۔ کالج کے دنوں میں امرت کور کے کئی دیوانے تھے اور وہ ان سے وقتاً فوقتاً دل لگی کرتی۔ وہ ان کی آپسی رقابتوں سے

فائدہ اٹھا کر ریستورانوں اور ہوٹلوں میں ان کی دعوتیں قبول کرتی حالانکہ اس کی سہیلیوں خاص کر سریتا کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔لڑکوں میں اس کو تھا مو قسم کے لڑکے زیادہ پسند تھے کیونکہ ان میں نسوانی خصائل غالب ہوتیں جسے اونچے طبقے کے لوگ تہذیب کی علامت گردانتے ہیں۔

گریجویشن کے بعد امرت کور نے آئی اے ایس کا امتحان پاس کیا اور پھر ایٹانگر میں ڈسٹرکٹ کلکٹر کے عہدے پر تعینات ہوئی۔

کالج کے دنوں میں ہی اس کی ملاقات ونود اگروال سے ہوئی تھی۔ونود نفاست پسند، کم گو اور دروں بین تھا۔صبر اور برداشت کا مجسمہ۔البتہ دونوں کی عمر میں کافی تفاوت تھا۔ونود کی پہلی بیوی اپنے دونوں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور پھر کبھی واپس آنے کا نام نہ لیا۔یہ راز امرت کور پر شادی کے بعد ہی کھلا۔خیر امرت نے ونود کو اپنانے کے لیے ساری دنیا سے لوہا لے لیا۔ونود میں اسے ایسا مرد مل گیا جو اس کی مردانہ روی کو جذب کر سکتا تھا۔اس نے کبھی بھی امرت کی سگریٹ اور شراب نوشی پر اعتراض نہیں کیا۔اس کے برعکس دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر ایک دوسرے کی خلاؤں کو پُر کرنے کی کوشش کرتے۔بہر حال اس انتظام کا منفی پہلو شادی کے بعد جستہ جستہ سامنے آیا۔خوش غلاف امرت کور کو جسمانی طور پر جس مرد کی آرزو تھی وہ اسے نہ مل پایا۔اس کو ونود کی شخصیت میں نسائیت کے عنصر، جو پہلے کبھی اچھے لگتے تھے، اب کھلنے لگے۔بچے تو خیر پیدا ہوتے رہے مگر نہ وہ تسکینِ قلب حاصل ہوئی اور نہ ہی وہ تشفی۔امرت کور ایسے مرد کی طلبگار تھی جو اس کی تسخیر کرتا، نوچتا، بھنبھوڑتا، اذیتیں دیتا اور پھر پائمال کرتا۔روز بروز یہ طلب تیز تر ہوتی گئی۔اس نے مردوں کی کھوج جاری رکھی اور اس کے آئے دن کے قصے مشہور ہوتے گئے۔کسی نے اس کو مقامی ایم ایل اے کے ساتھ دیکھا اور کسی نے ٹرانسپورٹ کمشنر کے ساتھ۔ کسی نے نامور گالف کھلاڑی پریرا کے ساتھ دیکھا اور کسی نے چیف منسٹر کے ساتھ۔اس کے باوجود اکثر و بیشتر راتیں گھر میں اکیلے ہی کاٹنی پڑتی تھیں۔شراب کے نشے میں جب وہ ونود میں اپنے مرد کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تو مایوس ہو جاتی اور غصے میں آ کر آپے سے باہر ہو جاتی۔کمرے کی خوبصورت چیزیں پٹک پٹک کر توڑ دیتیں۔یہاں تک کہ اس نے ونود کے اوپر کئی بار شراب کی بوتلیں بھی پھینک دیں۔امرت نے کئی بار گھر کے دروازے بھی بند کر لیے اور نتیجے میں ونود کو جاڑوں کی کئی راتیں گھر سے باہر ٹھٹھرتے ٹھٹھرتے بسر کرنی پڑیں۔

ونود نے امرت کی یہ دیوانگی صرف اپنے دو بچوں کی خاطر برداشت کر لی۔اس نے اتنے زخم کھا کر بھی کبھی منہ سے اُف نہ کی۔بار بار کی اہانت کے باوجود اس نے وفادار کتے کی مانند بیوی کے در کو نہیں چھوڑا مگر امرت اس کا کچھ اور ہی مطلب نکالنے لگی۔وہ سمجھتی تھی کہ ونود اس کے ساتھ اس لیے چپکا ہوا ہے کیونکہ وہ بہت بڑی افسر ہے۔اس کے پاس دولت بھی ہے اور عزت بھی۔وہ طاقت کے نشے میں چور تھی اور اپنے خاوند کو جوتیوں کی نوک پر مارتی۔روز بروز اس کے ظلم بڑھتے ہی چلے گئے۔جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو ونود نے اپنی جان بچانا ہی مناسب سمجھا۔گھر میں باقی رہے امرت کور اور اس کے اسکول جاتے دو بچے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔

ماں باپ کے تصادم میں اگر کوئی متاثر ہوتا ہے تو وہ ان کے بچے ہوتے ہیں۔معصوم چکی کے دو پاٹوں میں پستے رہتے ہیں۔کم سنی میں وہ یہ طے بھی نہیں کر پاتے کہ کس کا ساتھ دیں۔ماں کا یا باپ کا۔ایک جانب ماں کان بھرتی ہے اور دوسری جانب باپ اپنی حرکتوں کو جائز ٹھہراتا ہے۔بچوں کو اندر ہی اندر گھُن لگ جاتا ہے۔

امرت کور کے بچے صبح سے شام تک اسی فکر و تردد میں گم رہتے کہ ان کے گھر میں وہ سکھ اور شانتی کیوں نہیں جو ان کے دوستوں کے گھروں میں میسر ہے۔وہ خود سے سوال کرتے۔

''سب کے ماں باپ ایک ہی چھت کے نیچے مل جل کر رہتے ہیں، ایک دوسرے کے سکھ دکھ بانٹتے ہیں، پھر کیوں ہمیں یہ زندگی کا ادھوراپن جھیلنا پڑتا ہے؟''

ماں ہمیشہ پتا جی کو الزام دیتی ہے کہ اس نے مجھے دھوکا دیا، اپنی پہلی شادی کے بارے میں اندھیرے میں رکھا مگر وہ خود کونسی بے عیب اور بے تقصیر عورت ہے۔ایسی کون سی بری عادت ہے جو اس میں نہیں ہے۔حالات کے مدنظر اس کو کیا حق بنتا تھا کہ ہم دونوں کو اس دنیائے غم و تفرقہ میں لائے۔جہنم میں لا کر ڈال دیا ہے ہمیں۔جب سے ہوش سنبھالا ہے پتا جی کا منہ تک نہیں دیکھ پائے۔''

وہ دونوں مجبوراً ماں کے ساتھ اس گھر میں رہتے تھے۔کتے بلیاں ہوتے تو دودھ سے چھٹکارا پاتے ہی اپنی الگ دنیا بسا لیتے مگر انسان کے بچوں کو قدرت نے عمر قید دے رکھی ہے۔بیس بائیس سال ماں باپ کے رحم و کرم پر رہنا پڑتا ہے۔تاہم دونوں نے احتجاج کیا اور ان کے احتجاج کا ڈھنگ نرالا تھا۔جیتو نے اسکول چھوڑ کر فن مصوری اور سیاحت کی آڑ میں دربدری

کو گلے لگالیا جبکہ تانیا نے اپنی بھاوناؤں کا اظہار سنگیت کے ذریعے کیا۔ جیتو مغربی سیلانیوں کے ہمراہ کُرتا اور جینز زیب تن کیے، کندھے پر جھولا لٹکائے اور گلے میں رُدرا کھش کی مالائیں پہنے دم پر دم مارتا ہوا پراچین گپھاؤں اور مندروں کی کھوج میں نکل پڑا۔ جبکہ تانیا نے سنگیت منڈلیوں کے ساتھ کنسرٹس دینے کے لیے سال کے بیشتر دن گھر سے باہر گزارے۔ اس نے اپنے ساتھ چلم تو نہیں رکھی البتہ بے چاری کو ذیابیطس کا کِٹ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ صبح نیند سے اٹھتے ہی وہ نشے کے بدلے انسولین کا ٹیکہ لگالیتی جس کے سبب اس کی رانیں چھلنی ہو چکی تھیں۔

امرت کور اب گھر میں اکیلی رہتی۔ گھر میں صرف نوکرانی کو آنے کی اجازت تھی۔ ہر چیز گرد و غبار سے اٹی رہتی۔ نقاہت کے سبب اس نے گھر کو سنبھالنا چھوڑ دیا تھا۔ نوکرانی جو بھی من مانی کرتی، غنیمت جان کر چپ چاپ سہہ لیتی۔ کبھی کبھار کال بیل کی گھنٹی بجتی تو دروازہ کھولنے سے پہلے دس بار اطمینان کر لیتی کہ آدمی جانا پہچانا ہے یا نہیں۔ اس مردانی کو اب دنیا سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اب اس کے سگے سمبندھی بھی بہت کم دکھائی دیتے۔ سب لوگ اپنی گھر گرہستی میں مصروف تھے۔ پھر اس کے لیے وقت کہاں سے نکالتے۔ وہ انسانوں سے کیا، اب پرچھائیوں سے بھی ڈرنے لگی تھی۔ کال بیل، ٹیلیفون کی گھنٹی، بادلوں کی گھن گرج اس کا دل دہلا دیتیں۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے خول میں سمٹ کر رہ گئی۔ چڑیوں کی طرح کھانا چگتی اور ہر دم موت کا انتظار کرتی۔

موت بڑی ہٹ دھرم ثابت ہو رہی تھی۔ آنے کا نام بھی نہیں لے رہی تھی۔ بہر حال پھر جب ایک دن آئی تو تین روز کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ اندر اس کی لاش سڑ رہی ہے کیونکہ نوکرانی چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلی گئی تھی اور دونوں بچے پیرس میں اپنی زندگی کی تلخیوں کا اظہار ڈھونڈ رہے تھے۔

●□●

# آغوشِ ہوس

اروناچل سے میرا ٹرانسفر میگھالیہ ہوا۔ میگھالیہ......یعنی بادلوں کا مسکن جہاں دن بھر بادل اور سورج ایک دوسرے کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔ میگھ راج کے موڈ کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کب کہاں برسے کسی کو معلوم نہیں۔ اس ریاست کی راجدھانی شیلانگ پہاڑی پر واقع ہے اور مسلسل بارشوں کے سبب ہمیشہ اجلی اجلی رہتی ہے۔ انہی بارشوں کے خوف سے اکثر راہ گیر اپنے ہاتھوں میں چھاتے اٹھائے پھرتے ہیں۔

دفتر بند ہونے کے بعد یہاں کا سماں دلفریب ہوتا ہے۔ جدھر دیکھو خوش نما منگولی دوشیزائیں اپنے مخصوص قبائلی پیراہن میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ناٹی، کج نگاہیں، چکنے اور ملائم جسم جن پر نظریں پھسل جاتی ہیں۔ چلتی ہیں تو اپنے پیچھے کستورے ہرن کی مانند خوشبوئیں چھوڑ جاتی ہیں جسے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ ابھی ابھی یہاں سے کوئی حسینہ گزر گئی ہوگی۔

یہاں کے باشندے عموماً کھاسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سادہ لوح، نیک نیت اور پرخلوص۔ حسب نسب ماں کے توسط سے چلتا ہے۔ گھر کی ساری جائیداد کنبے کی سب سے چھوٹی لڑکی کو ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شادی بیاہ کے معاملے میں ان لڑکیوں کی بڑی مانگ رہتی ہے۔ بڑی لڑکیوں کو کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا۔ معاشرے پر عورتوں کا غلبہ ہے۔ کھیت کھلیان ان کے، کوئلے کی کھانیں ان کی، حتیٰ کے تجارت بھی ان کی۔ مرد تو بس نٹھلے بیٹھے رہتے ہیں۔ عورتوں کی اطاعت اور جی حضوری کرنے میں عمر گنوا دیتے ہیں۔ کہیں کام ملا تو ملا ورنہ آرتی کے وقت سو گئے مال بھوگ کے وقت جاگ اٹھے۔ ان کے لیے زندگی کا مقصد صرف حصولِ لذت ہے اور کچھ بھی نہیں۔

سورج ڈھلنے کے ساتھ ہی شراب و شباب کی محفلیں سجنے لگتی ہیں۔ نشے میں چور مرد اور عورتیں ناچ گانوں میں محو ہو جاتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً ہنگامہ آرائیاں بھی ہوتی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کرسچن مشنریوں نے ان قبائلوں کو مہذب بنانے کا بیڑا اٹھا لیا۔ جنگ کے دوران فوجوں نے ان معصوم لوگوں کا بھرپور استحصال کیا اور ان کی عورتوں کو پاپوش سمجھ کر بے عزت کیا۔ اب وہی لوگ تہذیب کی مشعلیں ہاتھوں میں اٹھائے ان قبائلوں کو تاریک غاروں میں سے باہر نکالنے میں سرگرم عمل ہیں۔ جگہ جگہ مشنری اسکول قائم کیے گئے تاکہ ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی جائے کہ ان کے اپنے رسوم اور اعتقادات فرسودہ اور گھٹیا ہیں جبکہ عیسائیت ہی ان کو مہذب کرنے اور نجات دلانے کا واحد ذریعہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ اپنی سادہ لوحی اور معصومیت بھلا کر سنگ دل، مکار اور مادہ پرست بنتے گئے۔ مقامی حالات کے مدِ نظر ان مشنریوں کو عیسائیت کی از سرِ نو تشریح کرنی پڑی اور خاص طور سے دو چیزوں کی چھوٹ دینی پڑی۔ ایک شراب نوشی کی اور دوسری جنسی آزادی کی۔ انہیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ صدیوں سے مروّج ان رسوم پر پابندی لگانے سے یہ قبائل عیسائیت سے منہ نہ موڑ لیں اور کہیں طسمانیہ کی تواریخ پھر سے دہرائی نہ جائے۔

اتفاق سے شیلانگ کلب میں ایک میزو افسر زاپھانگ سے میری دوستی ہوئی۔ زاپھانگ سنٹرل سروسز میں قبائلی کوٹا سے داخل ہوا تھا۔ رئیسوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بیوی اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑے ٹھاٹھ باٹ سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ شراب اور شباب کا رسیا تھا۔ اخلاص اور دردمندی کے باعث کافی مقبول تھا۔ اس کے دفتر میں ایسی کوئی لڑکی نہ تھی جو کبھی نہ کبھی اس کی ڈانس پارٹنر نہ رہی ہو۔ چونکہ بہت ہی سوشل قسم کا آدمی تھا لہٰذا آئے دن بات بات پر اپنے ہاں پارٹیوں کا اہتمام کرواتا تھا۔

زندگی سے مزے لوٹنا کوئی ان قبائلوں سے سیکھے۔ ہر غم کو شراب کے ساتھ گھول کر پی جاتے ہیں۔ میں نے انہیں بارہا موت پر خندہ زن ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایک بار زاپھانگ اچانک میرے گھر میں وارد ہوا اور حیرت سے بول اٹھا۔ ”ارے بھائی۔ اتنا بڑا ہاؤس اور تم اکیلا رہتا ہے۔“

”مجبوری ہے، زاپھانگ صاحب۔ میری مسز مزید تعلیم کے لیے آگرہ گئی ہوئی ہے اور بچے بھی اسی کے ساتھ ہیں۔“

”اوہ، آئی سی۔ بڑے خوش نصیب ہو یار۔ یہاں تو ہمارا وائف ایک منٹ بھی گھر چھوڑ کر

نہیں جاتا۔ ایک روز ہم ٹمہارے ہاؤس میں یار لوگ کے ساتھ پارٹی کرنا مانگتا ہے۔ یونو، میں، گوئینکا اور مایا......بس ٹین لوگ۔''

''مایا......؟ کون مایا......؟'' میرے ذہن کے پردے پر علامت استفہامیہ نمودار ہوئی مگر میں خاموش رہا۔ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بس ہنس کر بات ٹال دی۔

ایک ہفتہ کے بعد زاپھانگ نے ٹیلی فون پر اطلاع دی، کہ آج مایا نے ٹائم دیا ہے اور شام چھ بجے پارٹی ہوگی۔ میں پریشان ہوگیا۔ دو روز قبل ہی میری بیوی کا خط آیا تھا۔ وہ اپنی ہم جماعتوں کے ساتھ نارتھ ایسٹ کے اسٹڈی ٹور پر نکلی تھی اور غالباً رات بھر کے لیے شیلانگ آنے والی تھی۔ سوچنے لگا کیا کروں۔ اگر دونوں کا تصادم ہوا پھر کہیں کا نہ رہ جاؤں گا۔ کوئی سبیل نہ پا کر سارا معاملہ بھگوان پر چھوڑ دیا۔ تاہم زاپھانگ کو اس کی ممکنہ آمد سے متنبہ کردیا۔ ''کوئی خاص پرابلم تو نہیں ہونی چاہیے البتہ بہتر یہ ہوگا کہ آنے سے پہلے ٹیلی فون پر مجھ سے دریافت کرلینا۔''

''یہ کام ٹو مشکل ہے۔ اوکے، ایک طریقہ نکل سکتا ہے۔ گوئینکا کا ڈکان ٹمہارے مکان کے نزدیک ہے۔ ٹم چھ بجے سے پہلے اس کا ڈکان پر جاکر پتا لگانا۔''

''ٹھیک ہے۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔ شام کے چھ بجنے والے تھے۔ گلابی جاڑوں کی وجہ سے باہر گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ میری بیوی کے آنے کی سمبھاونا بہت کم لگ رہی تھی۔ میں ٹوہ لگانے کے لئے گوئینکا کی دوکان پر چلا گیا۔

''ارے تم! چھ بج گئے کیا؟ ٹائم کا تو پتہ ہی نہیں چلا۔'' گوئینکا نے مجھے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔

یہ حقیقت تھی کہ بزنس مین ہونے کی وجہ سے گوئینکا کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہتا تھا۔ بیس سال پہلے وہ راجستھان سے ہزاروں میل سفر کرکے یہاں چلا آیا تھا۔ مارواڑیوں کی خصوصیت ہے کہ وہ مٹی کو سونگھ کر بتا سکتے ہیں کہ یہ روپیہ اگلے گی یا نہیں۔ گوئینکا نے بھی شیلانگ کی مٹی کو سونگھا تھا اور اسے زرخیز پایا تھا۔ پھر یہیں کا ہوکر رہ گیا۔ پہلے آٹوموبائیل کی دُکان کرلی، پھر سنیما خریدا اور اب جگہ جگہ اس کی بزنس کا جال پھیل گیا ہے۔ چار پانچ سال کے بعد ایک کوٹھی بھی خرید لی۔ کروڑوں کی جائیداد بے نامی ہے کیونکہ ان علاقوں میں غیر قبائلی لوگ جائیداد نہیں خرید

سکتے۔ گوئینکا نے ایک مقامی کھاسی سے دوستی کرلی، اس کو اپنا پارٹنر بنالیا اور پھر اسی کے نام پر املاک خریدتا رہا۔ کھاسی کو اپنے حصے کے روپے ہر مہینے پہنچاتا رہا۔ کوٹھی خریدنے کے دوسال بعد ہی ایک سانولے رنگ کی بچہ پیدا کرنے والی مشین گھر میں لاکر رکھ دی جو ہر زچگی کے ساتھ پھولتی چلی گئی۔ پانچ بچے جننے کے بعد اب گھنٹیا اور ذیابیطس کے روگ پال رہی ہے۔ گوئینکا کی تفریح کا سامان یا تو شراب رہ گیا ہے یا پھر قبائلی حسن جن پر وہ اپنا فالتو سرمایہ بے دریغ لٹاتا رہتا ہے۔

دُکان کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی لڑکی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ خود ہی بات سمجھ میں آگئی تاہم پوچھ لیا۔

''تمہاری دوست مایا نہیں آئی گوئینکا؟''

''نہیں یار، چھ بجے کا ٹائم دیا تھا۔ چھ دس ہوگئے۔ ابھی تک نہیں آئی۔ سالی بہت بھاؤ کھاتی ہے۔ اب تو اندھیرا بھی بہت ہوگیا ہے۔ شاید نہیں آئے گی۔''

میں من ہی من میں خوش ہوگیا۔ مگر اپنی خوشی کا اظہار نہ کرسکا۔

گوئینکا اپنا رو کڑ لکھنے میں منہمک تھا۔ سر اٹھائے بغیر بولا۔

''دو ہجار طے ہوا تھا۔ پانچ سو ایڈوانس لے گئی۔ لگتا ہے دھوکا دے گئی۔ نہ جانے جاپھانگ کیا سمجھے گا۔ آج اس کا برتھ ڈے ہے۔ سوچے گا میں نے جھوٹا وعدہ کرلیا۔''

''ٹھیک ہے۔ آئے گی تو لے آنا۔ مطلع صاف ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اجازت لے لی۔

''او کے، مہیش بھائی۔ تھینک یو۔ تمہارے کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔'' سر جھکائے ہی گوئینکا نے الوداع کہا۔

میں وہاں سے چل پڑا۔ سوچا جان بچی لاکھوں پائے۔ اب بیوی آئے بھی تو کوئی پرابلم نہیں۔ گھر کی جانب جو چھوٹی سی سڑک جارہی تھی اس کے اختتام پر نو دس سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ میں سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا کہ سامنے سے ایک خوبصورت کھاسی لڑکی لڑکھڑاتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اس کا پیر پھسل گیا۔ میں نے لپک کر اس کو سہارا دیا اور سیڑھیاں اترنے میں مدد کی۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اس نے اپنی خمار آلود آنکھیں اٹھا کر

میر اشکریہ ادا کیا۔

''تھینک یو۔تھینک یو۔''

''کیئر فار سم مور ڈرنک۔تھوڑی اور وہسکی ہو جائے۔''

وہ ہنس دی اور مجھے دیکھتی رہی۔نہ ہاں بولی نہ ناں۔البتہ اس کی پیاری پیاری مخمور نگاہوں میں اقرار کے دیئے خود بخود فروزاں ہو گئے۔

''یو آر اے نائس مین۔مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔'' میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا کیونکہ اس شہر میں کھاسی لڑکی کے ساتھ سرِ عام چلنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

چند ہی منٹوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بعد گھر کے اندر داخل ہوئے۔تنگیٔ وقتِ ملاقات کے سبب میں نے جلدی سے گلاسوں میں وہسکی ڈال کر اسے پیش کی۔جام ٹکرانے کے ساتھ ہی سارا ماحول رقص کناں ہو اٹھا۔

''تمہیں جلدی جانا پڑے گا کیونکہ میرے کچھ مہمان آنے والے ہیں۔''

''کون آئیں گا۔اور کوئی لڑکی کو ٹائم دیا ہے کیا۔؟''

''اوہ نو، میرے آفس کے فرینڈس آ رہے ہیں۔رات کو کھانے پر بلایا ہے۔''

''ہم سوچا تھا کہ رات تمہارے پاس کاٹے گا۔''

''سوری، آج ممکن نہیں۔پروگرام پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔ورنہ کوئی بات نہ تھی۔سچ پوچھو تو میں بھی نہیں چاہتا کہ تم چلی جاؤ۔بلیو می۔مجھے تم بہت اچھی لگیں۔سٹریٹ فارورڈ۔نائس گرل۔تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

''لورینا مرک۔تم مجھے لورین کہہ سکتا ہے۔کیا میں کل آ سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔کل ویسے بھی سنڈے ہے۔میں گھر پر ہی ملوں گا۔دن میں کبھی بھی آ جاؤ۔''

''او کے'' وہ اتنا کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔اپنے کپڑے درست کیے اور میری گال پر پیار بھرا بوسہ دے کر باہر اندھیرے میں گم ہو گئی۔ادھر کنٹونمنٹ کے گھنٹے پر کسی نے سات ضربیں لگا دیں۔

ابھی میں اپنے آپ کو سنبھال ہی رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے میری بیوی کھڑی تھی۔ اگر پندرہ منٹ پہلے آجاتی تو ہماری شادی اُسی دن ٹوٹ گئی ہوتی۔ وہ مجھ سے میرا حال چال پوچھنے لگی۔

اور میں 'ہوں ہاں' کرتا ہوا اسے آنکھیں ملانے سے کتراراہا تھا۔ من میں گھبراہٹ ہورہی تھی کہ اگر زاپھانگ اور گوئینکا آگئے تو پھر کیا ہوگا۔ کیا جواب دوں گا۔

تازہ دم ہونے کے لیے میری بیوی غسل خانے میں چلی گئی۔ ادھر دروازے پر پھر سے کال بیل بج اٹھی۔ میں دوڑتا بھاگتا صدر دروازے کی طرف لپکا اور دروازہ کھولتے ہی زاپھانگ کو خبردار کرنے کی غرض سے بہ آواز بلند گویا ہوا۔

''ہیلو زاپھانگ۔ کیا حال ہے؟ میری بیوی بھی ابھی آئی ہے۔''

میں نے سوچا تھا کہ وہ میری بات سن کر واپس چلا جائے گا مگر وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ وہ ٹو آیا ہی نہیں۔''

میری جان میں جان آگئی۔ دونوں دوست اندر آگئے۔ پھر شراب کے دور چلے۔ زاپھانگ اپنے ساتھ کچھ ناشتہ لے کر آگیا تھا۔ میری بیوی نے بھی مونگ پھلی اور پکوڑے تل کر سامنے رکھ دیے۔ پارٹی رات کے دس بجے تک چلتی رہی۔

صبح سویرے میری بیوی ٹیکسی سے گوہاٹی روانہ ہوگئی۔ اس کے رخصت ہوتے ہی میں نے لمبا سا سانس کھینچ لیا اور بھگوان کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری عزت بچائی۔

دن کے دو بجے لورین حسب وعدہ چلی آئی۔ میں نے خواب و خیال میں بھی سوچا نہ تھا کہ وہ آئے گی۔ عموماً ایسی لڑکیوں کے نام، پتے اور ٹیلیفون نمبر فرضی ہوتے ہیں اور ان کے وعدے بھی جھوٹے ہوتے ہیں۔ بہر حال وہ آئی اور بے تکلف ہوکر بیٹھ گئی جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ آج اس نے شراب نہیں پی تھی اس لیے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ ہم دونوں نے آپس میں خوب ساری باتیں کیں۔ گفتگو کے دوران اس نے بتایا کہ وہ تین بہنیں ہیں۔ بچپن ہی میں ان کے ماں باپ وفورِ شراب نوشی سے جگر کی سوزش میں مبتلا ہوکر مر گئے۔ چھوٹی بہن کو ترکے میں ساری جائیداد مل گئی۔ اس نے اپنا گھر الگ بسا لیا جبکہ وہ اور منجھلی بے آسرا رہ گئیں۔ انہوں نے کلکتہ جاکر ایک بہت بڑے ہوٹل میں ایسکارٹ کا کام کیا۔ ایک رات کے تین ہزار مل جاتے

تھے۔ آدھا روپیہ ہوٹل اور دلال کی نذر ہوتا تھا اور تھوڑی بہت رقم اپنے رکھ رکھاؤ پر خرچ کرنی پڑتی تھی۔ خیر دو سال میں دس لاکھ جمع کر کے دونوں بہنیں واپس شیلانگ چلی آئیں۔ یہاں ایک چھوٹا سا گھر خریدا اور باقی سرمایہ تجارت میں لگا دیا۔ اب بھی کبھی کبھار کسی دوست کے ساتھ محض تفریح کے لیے چلی جاتی ہیں۔

اپنی کہانی سناتے وقت وہ پیگ پر پیگ پئے جا رہی تھی۔ اس کی خمار آلود آنکھوں کا خالی پن صاف جھلک رہا تھا۔ شاید لورین کو یہ احساس تھا کہ اس کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ تھا۔ وہ کسی کو اپنا نہیں کہہ سکتی تھی۔ چند خلوص و محبت بھرے فقروں نے اسے میرا دیوانہ بنا دیا تھا۔ وہ مجھ سے کل رات کے واقعے کے بارے میں استفسار کرنے لگی۔

''کل تمہارا دوست لوگ آیا تھا یا نہیں؟''

''ہاں آئے تھے مگر ان کی گرل فرینڈ نہیں آئی۔''

''گرل فرینڈ......کون گرل فرینڈ......؟''

''مایا......یہی نام بتایا تھا انہوں نے۔''

''تمہارے فرینڈس کا نام کیا ہے؟''

''زاپھانگ اور گوئینکا......زاپھانگ کسٹمز افسر ہے اور گوئینکا رِٹز سینیما کا مالک۔''

''اوہ گوئینکا! تو تم ان کا انتظار کرتا تھا۔ کیوں ان کا مایا نہیں آیا۔''

''تم گوئینکا کو جانتی ہو۔؟''

''ہاں۔ اچھی طرح سے۔ اس کا مایا تو میں ہی ہوں۔ کل رات میں ہی گوئینکا کے پاس جاتا تھا کہ راستے میں تم ملا۔ اس نے ٹُو تھاوزنڈ کا پرامز بھی کیا تھا۔''

''پھر تم گئیں کیوں نہیں؟ دو ہزار چھوڑ کر میرے ساتھ کیوں چلی آئی؟''

''ہونہہ......ٹو تھاوزنڈ کیا ہوتا ہے۔ لائف میں منی سب کچھ نہیں ہوتا ہے مین۔ تم ہم کو بہت اچھا لگا۔ پرفیکٹ جنٹل مین۔ تم کہہ دو تو پورا لائف ہم تمہارا سرونٹ بن کر رہے گا۔ یو آر اے سویٹ گائے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے میرے گلے کے اردگرد اپنی نرم و ملائم بانہوں کا گھیرا ڈال دیا اور پھر میرے تپتے ہوئے سوکھے ہونٹوں کو سیراب کرنے لگی۔

''مجھے بھی تم بہت اچھی لگتی ہو۔ بلیو می، لورین۔'' میں نے اپنے گلاس سے اس کو وہسکی پلا کرا پنے قول کی تصدیق کی۔

میں جب تک شیلانگ میں تعینات رہا، لورین اکثر میرے پاس چلی آتی۔ وہ اپنی زندگی کے خالی پن کو پر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس وقت ہم دونوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ وقت تھم چکا ہے اور یہی دو چار پل ہماری زندگی کا ماحصل ہیں۔

●□●

# گاڑی کا انتظار

''سنیے، ٹائم کیا ہو رہا ہے؟''۔

''آپ کی کلائی پر بھی تو گھڑی ہے پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟''

''میری گھڑی کب سے رُکی پڑی ہے۔ایک زمانہ تھا۔گھڑی میں کوک بھرا کرتے تھے اور وہ چل پڑتی تھی۔اب تو بازار سے سیل خرید کر اس میں ڈالنی پڑتی ہے۔یہاں اسٹیشن پر بہت مہنگی ملتی ہے۔اب گھر پہنچ کر ہی ڈلواؤں گا۔''

''اوہ میں سمجھ گیا۔خیر! (گھڑی پر نظر ڈال کر) اس وقت گیارہ بجے ہیں۔''

''گیارہ!''

''ہاں، پورے گیارہ بج رہے ہیں۔آپ کو کس ٹرین کا انتظار ہے؟''

''ڈیرہ دون کا۔''

''وہ چار گھنٹے لیٹ چل رہی ہے۔''

''اس گاڑی کا کوئی ٹھور ٹھکانہ ہی نہیں رہتا۔بعض اوقات تو بارہ بارہ گھنٹے دیر سے پہنچتی ہے۔''

''اجی ان ٹرینوں کا کیا۔نہ آنے کی کوئی خبر اور نہ منزل تک پہنچانے کی کوئی گارنٹی۔ہفتے میں ایک دو ایکسیڈنٹ ہونا تو معمول بن چکا ہے۔''

''گاڑی میں سوار ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یم راج کے واہن پر سواری کر رہے ہیں۔''

''موت کے فرشتے بھی اب بھینسوں کو چھوڑ کر ٹرینوں ہی میں سوار ہوتے ہیں۔''

''ایک زمانہ تھا کہ ریل گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا نہیں ریلوے منسٹر استعفیٰ دے دیتا تھا۔''

''اجی اب ویسا زمانہ کہاں رہا۔نہ وہ شرم باقی رہی اور نہ ہی وہ ایمانداری۔اگر ہر

ایکسیڈنٹ پر ریل منسٹر استعفیٰ دینے لگے تو سال میں سو سے زیادہ منتریوں کو حلف اٹھانا پڑے گا۔''

''مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود ریلوے ڈیپارٹمنٹ اپنی تشہیر میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ بھارتیہ ریل...... آپ کے آرام دہ سفر کی ضامن''

''اس کو پی آر کہتے ہیں بھائی۔ پبلک ریلیشنز۔ ان طریقوں سے عوام کی نظروں میں بھارتیہ ریل کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔''

''اجی چھوڑیے۔ کیا وقعت اور کیا مرتبہ! ایسا کون شخص ہے جو ان باتوں پر یقین کرتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ریلوے کی حقیقت کیا ہے۔ جتنا سرمایہ ان تشہیری مہموں پر صرف کیا جاتا ہے اسی سرمایے سے جنتا کے لیے اور سو سودھائیں دستیاب کی جا سکتی ہیں۔''

''بھارتیہ ریل...... میری بھارتیہ ریل...... ٹکٹ والے مسافر کھڑے رہیں اور بنا ٹکٹ والے سیٹوں پر براجمان...... میری بھارتیہ ریل۔'' (قہقہہ)

''کیا خوب کہی۔'' میری بھارتیہ ریل۔ جہاں کھڑکی کھولنے سے پہلے ہی بکنگ فل ہو جاتی ہے، مگر ایجنٹوں کے پاس ٹکٹیں بلیک میں مل جاتی ہیں۔ میری بھارتیہ ریل۔''

''ہاں میری بھارتیہ ریل۔ جہاں لسٹ کے مطابق ہر ٹرین ٹپ نظر آتی ہے مگر حقیقت میں اندر سے خالی ہوتی ہے۔ میری بھارتیہ ریل۔''

''ریل۔ میری بھارتیہ ریل۔ جہاں آدھے سے زیادہ لوگ گاڑی کی چھت پر سفر کرتے ہیں۔ ریل، میری بھارتیہ ریل۔''

''میری بھارتیہ ریل۔ جہاں آپ کے استقبال کے لیے فرش پر مونگ پھلی کے چھلکے بچھائے جاتے ہیں۔ میری بھارتیہ ریل۔''

''واہ کتنا اچھا جنگل بن گیا۔ ہم شاید اپنے موضوع سے ہٹ گئے۔ ہم بات کر رہے تھے حادثات کی۔''

''جی ہاں۔ خیر حادثات کا کیا۔ وہ تو ہوتے ہی رہیں گے۔ آخر برسوں سے ٹوٹی پھوٹی پٹریوں پر عمر رسیدہ گاڑیاں چلتی ہیں۔ پھر حادثے نہیں ہونگے تو اور کیا ہوگا۔''

''کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہے؟''

''ایک ہی علاج ہے۔ گاڑی سے سفر کرنا چھوڑ دو۔ پھر کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔اتنی لمبی مسافتیں کیسے طے ہو پائیں گی۔ایک طرف تو ہم کہتے ہیں کہ دنیا چھوٹی ہوگئی ہے۔فاصلے کم ہوگئے ہیں۔رسل ورسائل قوموں کوایک دوسرے سے قریب لارہے ہیں۔دوسری طرف یہ قنوطی نظریہ زیب نہیں دیتا۔ہم عالمی گاؤں کے ذی عزت باشندے ہیں۔ریل گاڑی میں سفر کرنا ہمارا بنیادی حق ہے۔ہم سبک خیزی کے عادی ہو چکے ہیں۔گھنٹوں کا کام منٹوں میں کرنا چاہتے ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ وقت کی سوئی پیچھے کی طرف گھمائیں۔''

''اگر ریل محفوظ نہیں تو ہوائی جہاز سے سفر کر لیجیے۔ہمیں ہوائی سفر سستا بنانا چاہیے۔تا کہ لوگ صبح کا ناشتہ کشمیر میں اور دوپہر کا کھانا کنیا کماری میں نوش فرمائیں۔''

''ارے صاحب، ہوائی جہاز کون سے محفوظ ہیں۔آئے دن ہوائی جہازوں کے بھی حادثے ہوجاتے ہیں۔کچھ قدرتی اور کچھ انسانی کارستانی سے۔''

''ہوائی جہازوں میں تو ریل گاڑیوں سے بھی زیادہ ڈر لگتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ موت کا فرشتہ اپنے پنکھ پھیلا کر ہمیں سورگ کی اور سیدھا لے جارہا ہے۔''

''قدرتی حادثات پر کنٹرول کرنا مشکل ہے مگر ہم نے خود بھی ہوائی سفر کو غیر محفوظ بنادیا ہے۔کہیں جہاز ہائی جیک ہورہے ہیں اور کہیں ان میں بم رکھے جاتے ہیں۔اب تو جہازوں کو ہی بم کے بدلے استعمال کیا جارہا ہے۔''

''ہائی جیک کرنا تو بہت ہی گھناؤنی حرکت ہے۔بے چارے معصوم لوگ گھنٹوں زندگی اور موت کے درمیان لٹکتے رہتے ہیں، اگر ہماری لڑائی کسی حکومت یا نظامِ حکومت سے ہے تو ان کے محافظوں سے لڑیں، غریب لوگوں کا اس میں کیا دوش؟''

''موت کی آہٹ خود موت سے زیادہ بھیانک ہوتی ہے۔''

''کتنا مشکل بنادیا ہم نے ہوائی سفر کو۔ایک گھنٹے کے سفر کے لیے دو گھنٹے پہلے گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔پھر سیکورٹی چیک کراؤ۔تب جا کر سفر شروع ہوجاتا ہے۔''

''اس احتیاط کے باوجود کوئی جہاز کولکتہ سے کابل پہنچ جاتا ہے اور کوئی ٹوین ٹاور سے ٹکرا کر امریکہ کو ہلا دیتا ہے۔''

''جو لوگ ایسا کرتے ہیں ہماری تہذیب کے دشمن ہیں۔خود موڈرن زندگی سے جوجھ نہیں

پاتے اس لیے تخریبی کارروائیوں میں ملوث رہتے ہیں۔''

''ایسے ہی لوگ ہیں جو ریل پٹریوں کے فِش پلیٹ اڑا لے جاتے ہیں۔گاڑیوں میں بم رکھتے ہیں۔ہوائی جہازوں کو اغوا کرتے ہیں اور پسنجر بسوں کو ہائی جیک کرتے ہیں۔دراصل وہ تخریبی ذہنیت کے مالک ہیں۔''

''ان کی سوچ ہی میں کجروی ہے۔وہ تعمیر کی سوچ ہی نہیں سکتے۔''

''بسوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔سنسان علاقے میں کسی بس میں گھس جاتے ہیں اور مسافروں کو لوٹتے ہیں یا پھر مارتے ہیں۔''

''زندگی کا ایسا کوئی شعبہ نہیں جہاں ان لوگوں کی پہنچ نہیں ہے۔ایک زمانہ تھا کہ ایسے کام، ڈاکو، قزاق اور سمندری لٹیرے کرتے تھے۔اب ان کے بدلے میں یہ موڈرن لٹیرے پیدا ہوئے ہیں۔تعلیم، تہذیب اور تمدن کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔درحقیقت روز بروز کرائم بڑھتا ہی جارہا ہے۔''

''ایسا کوئی سفر نہیں جو محفوظ ہو اور آدمی بلا وسوسہ سفر کر سکے۔''

''صاحب ایک سفر ہے۔وہ ہے آخری سفر۔آدمی نے اِدھر آنکھیں بند کر لیں اُدھر اس کو کاندھوں پر لاد کر قبرستان پہنچایا جاتا ہے۔اس سفر میں نہ کسی کی روک ہے نہ ٹوک۔نہ بلیک میں ٹکٹیں خریدنی پڑتی ہیں اور نہ ہی راستے میں راہزنوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔''

''آپ کو شاید معلوم نہیں۔اب آخری سفر میں بھی مشکلیں پیش آنے لگی ہیں۔حال ہی میں ممبئی میں ایک مخصوص علاقے کے عیسائیوں نے دھرنا دی۔ان کا مطالبہ تھا کہ ان کے مُردوں کو دفن کرنے کے لیے گورنمنٹ زمین الاٹ کرے۔یہ ایجی ٹیشن کئی سالوں سے چل رہی ہے مگر گورنمنٹ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔اس علاقے میں زمین بہت مہنگی ہے۔سوال یہ اٹھتا ہے کہ زمین مردہ لوگوں کو الاٹ کی جائے یا پھر زندہ لوگوں کو جن کے پاس رہنے کے لیے گھر نہیں۔اس مسئلے پر ہمیں سوچنا پڑے گا۔''

''ارے صاحب، ڈیرہ دون ایکسپریس آگئی۔چلئے سامان اٹھائیے۔نہیں تو ٹرین میں بھی جگہ نہیں ملے گی۔''

●□●

# قسمت کی پوٹلی

بچپن میں کہانیاں سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔کوئی بزرگ کہانی سنانے بیٹھ جاتا تو سبھی بچے اس کے اردگرد جمع ہو جاتے۔جاڑوں میں لطف اور بھی دوہرا ہو جاتا۔موسم سرما کی لمبی چھٹیاں، برف سے ڈھکی زمین، سائیں سائیں کرتی ٹھنڈی ہوائیں، پارہ صفر سے نیچے، کھڑکیاں دروازے بند، درزوں شگافوں پر کاغذ چپکا ہوا، نہانا دھونا معطل، گرم پھرن گلے سے گھٹنوں تک لہراتا ہوا اور اس کے اندر دہکتی ہوئی کانگڑی جس میں حرارت بخش کوئلہ دن بھر سلگتا رہتا، وقت کیسے گزرتا کچھ پتہ بھی نہ چلتا۔ماں بے چاری رسوئی میں گیلی لکڑیوں، برادے اور سوکھے گوبر سے جوجھتی رہتی مگر ٹائم پر چائے ناشتہ اور کھانا پروستی رہتی۔

کھیتی کا کوئی کام نہ ہونے کے باعث لسہ کاک جاڑوں میں ہمارے ہاں دو چار بار ضرور آتا۔سنا ہے بہت عرصہ پہلے وہ ہمارے گھر میں نوکر تھا۔گھر کے سارے کام کاج اور ڈھور ڈنگر سنبھالنا اس کی ذمہ داری تھی۔ان دِنوں ہمارے گھر میں ہُن برستا تھا۔گاؤں میں زمینیں تھیں۔سال بھر کا اناج بیٹھے بیٹھے گھر میں مل جاتا تھا۔البتہ آزادی کا سورج اُگتے ہی کشمیر میں زمینداری کا خاتمہ ہوا۔ادھر ہماری زمینیں گئیں اُدھر لسہ کاک کو انہی زمینوں میں سے چند بیگھے الاٹ ہوئے کیونکہ گاؤں میں اس کا سارا کنبہ ہماری زمینوں کی کاشت کرتا تھا۔اس کے باوجود اس نے توتے کی طرح کبھی آنکھیں نہیں پھیریں۔وقتاً فوقتاً تجدید وفا کے لیے چلا آتا۔

لسہ کاک کے پاس لوک کتھاؤں اور طلسمی کہانیوں کا ذخیرہ تھا۔بس فرمائش کی دیر تھی اور کہانی حاضر۔داستاں گوئی کا ہنر کوئی اس سے سیکھتا۔سننے والے ہمہ تن گوش ہو جاتے۔

ایک روز لسہ کاک نے ہاری پربت کی کہانی سنائی۔ہاری پربت، جو کسی دیو مالائی چڑیا کا کرشمہ ہے، سرینگر شہر کے وسط میں واقع ہے۔قلۂ کوہ پر ایک قلعہ بنا ہوا ہے جہاں سے اگلے وقتوں میں وادی کی حفاظت اور انتظامیہ کا کام چلایا جاتا تھا۔قلعے سے کچھ نیچے شارِکا دیوی

کا خوبصورت مندر ہے جہاں ہر روز علی الصباح ہزاروں شردھالو دیوی ماں کے درشن کرنے کے لیے میلوں پیدل چل کر آجاتے۔

مہیشر ناتھ پو پھٹنے سے پہلے ہی گھر سے نکل پڑتا۔حبہ کدل سے تین کلومیٹر کی مسافت پیدل طے کر کے گنپتی کے مندر پہنچ جاتا جہاں گھی کے چراغوں، دھوپ اور اگربتیوں کے خوشبوؤں کے درمیان باجماعت آرتی کا اہتمام ہوتا۔عجیب طلسمی سماں سا بندھ جاتا۔یوں تو مہیشر ناتھ گھر سے نکلتے ہی منتروں کی جاپ اور کشمیری لیلاؤں (لوک بھجنوں) کا ورد کرنا شروع کر دیتا لیکن سب کے ساتھ مل جل کر پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔گنپتی کے مندر کے بعد چکری شور کی باری آتی جہاں شارکا دیوی براجمان تھیں۔مندر تک پہنچنے کے لیے دو سو سے زائد پوڑھیاں چڑھنا پڑتیں۔'اوم نمو بھگوتی اوم نمو بھگوتی' کا پاٹھ کرتے ہوئے مہیشر ناتھ بڑی ہمت کے ساتھ چڑھائی چڑھتا اور پھر دیوی کے قدموں میں جا گرتا۔اس وقت مہیشر ناتھ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ان آنسوؤں میں اس کی غربت، مفلسی، ناداری اور لاچاری چھپی ہوتی۔اس کے ٹوٹے ہوئے دل سے اٹھنے نالے آسمان میں دیولوک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے۔مہیشر ناتھ سیندور سے سجی ہوئی دیوی کو ٹکر ٹکر دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو۔

''ہے ماں، کیا تمہارے پاس اس غریب کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں؟ کیا میں عمر بھر دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھروں اور پائی پائی کا محتاج بنا رہوں؟''

پھر وہ بڑی نشٹھا سے دیوی ماں پر جل، چاول کے دانے اور پھول چڑھاتا۔رخصت ہونے کے سمئے بھی وہ دیوی ماں سے اس کا دلدر دور کرنے کی پرارتھنا کرتا۔دیوی درشن کے بعد ہاری پربت کا طواف کرنا ضروری ہے۔دو ڈھائی کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔مہیشر ناتھ راستے میں مزید دو چار مندروں میں بھی حاضری دے دیتا اور پھر کاٹھی دروازہ سے نکل کر واپس گھر کی جانب چل پڑتا۔

مہیشر ناتھ کی گرہستی کچھ زیادہ ہی بڑی تھی۔لڑکے کی تمنا میں اسکی بیوی نے چھ لڑکیوں کو جنم دیا تھا اور اب بیٹیاں قدم بہ قدم بلوغت کی اور بڑھتی جا رہی تھیں۔ان کا جہیز جٹانے کے غم میں مہیشر ناتھ اور اس کی بیوی دونوں سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے۔بیوی ویسے بھی آئے دن بیمار رہتی جبکہ وہ خود ایک پرائیویٹ دکاندار کے پاس ملازمت کرتا جہاں تنخواہ ملنے کی امید تب تک تھی جب تک

اس کی صحت برقرار رہتی ۔گر یچوٹی نہ پینشن ، چھٹی نہ بونس،بس کولہو کے بیل کی طرح کام کرو، جب تک گھومتے رہو گے اور مالک کو فائدہ پہنچاتے رہو گے تب تک خیر ہے ورنہ خلاص۔

مہیشر ناتھ جس بھی مندر کی چوکھٹ پر متھا ٹیکتا، ایشور سے پرارتھنا کرتا کہ اس کو غریبی سے کسی بھی طرح نجات دلا دے اور کم سے کم اس کو اس لائق بنا دے کہ وہ خوشی خوشی اپنی بیٹیوں کو وداع کر سکے۔

پھر ایک روز واقعی کرشمہ ہوا۔ جونہی وہ ہاری پربت کا طواف کر کے گھر کی طرف مڑا، کاٹھی دروازے کے پاس اس کا پاؤں ایک تھیلی پر پڑا جس کے اندر سے کسی دھات کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔اس نے کن اکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا اور اطمینان کر لیا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔پھر چپ چاپ تھیلی اٹھا کر اسے ٹٹولنے لگا۔اس کی حیرت کی اس وقت کوئی حد نہ رہی جب تھیلی کے اندر سے ہیرے جڑے ہوئے سونے کے زیورات برآمد ہوئے۔پریشانی اور حیرانگی کے عالم میں اسے کچھ بھی نہ سوجھی، تھیلی بغل میں دبا لی اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

رات بھر وہ جل بن مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔اس کے دماغ میں طرح طرح کے سوال اٹھ رہے تھے۔

''نہ جانے کس بیچارے کے زیورات ہوں گے......؟ نہ جانے کس دلہن کا سہاگ ان زیورات سے جڑا ہوگا......؟''

تھیلی میں اتنے زیور تھے کہ کم سے کم دو لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو سکتے تھے مگر اس کے ضمیر نے بغاوت کی۔وہ اپنے آپ کو گناہ گار گرداننے لگا اور رات بھر اس گناہ سے بچنے کی سبیلیں ڈھونڈتا رہا۔

دوسری صبح وہ معمول سے پہلے ہی تیار ہوا۔تھیلی کو ایک بڑے جھولے میں ڈال دیا تا کہ کسی کو کچھ دکھائی نہ دے اور الٹے راستے جا کر کاٹھی دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔وہاں سے جو بھی شخص گزرتا، مہیشر ناتھ اسے سوال کرتا۔

''بھائی صاحب، کل آپ کی کوئی چیز تو نہیں گری تھی؟''

''نہیں بھائی، میری کوئی چیز نہیں گری تھی۔'' سبھی حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے۔بہت دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ سے مہیشر ناتھ تھک کر چور ہو گیا مگر ہمت نہ ہاری۔آخر

کار اس کو وہ آدمی مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی۔
''بھائی صاحب، کل آپ کی کوئی چیز تو نہیں گری تھی؟''
''ہاں بھائی، زیورات سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ نہ جانے کہاں گر گئی''۔ راہ گیر کے پژمردہ چہرے پر امید کی کرن پھیل گئی۔ وہ اپنی خوشی کو چھپا نہ سکا۔
''کہاں پر گری تھی؟ کچھ نشانیاں بتا سکتے ہیں آپ؟''
''ہاں کیوں نہیں۔ بھائی صاحب، میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ اسی کے لیے زیور بنوائے تھے۔ وہی زیورات گھر لے جا رہا تھا۔ تھیلی میں رکھے تھے۔ اس تھیلی کو دیگر کپڑوں کے ساتھ ایک جھولے میں رکھا تھا اور سائیکل کے ہینڈل میں لٹکا دیا تھا۔ گھر پہنچا تو دیکھا تھیلی غائب۔ جھولے کی سلائی ادھڑ گئی تھی۔ شاید بھاری ہونے کی وجہ سے تھیلی گر گئی تھی ورنہ باقی ماندہ کپڑے تو صحیح سلامت تھے۔ تھیلی گہرے نیلے رنگ کی ہے جس پر اگتا ہوا سورج چھپا ہوا ہے''۔
تفصیل صحیح تھی۔ مہیشر ناتھ کو پورا یقین ہو گیا کہ وہ اجنبی ہی ان زیورات کا اصلی مالک ہے۔ اس نے اپنے جھولے سے تھیلی نکالی اور اصلی مالک کو سونپ دی۔ اجنبی اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ کر سکا۔ آخر کار اظہار تشکر کے بعد اس نے اپنی راہ لی۔ مہیشر ناتھ کو لگا کہ اس کے ذہن سے کوئی بھاری بھر کم بوجھ ہٹ گیا ہو۔
دوسرے روز حسب معمول مہیشر ناتھ پھر دیوی ماں کے مندر میں پانی، چاول اور پھول چڑھانے کے واسطے پہنچا اور ماں سے پراتھنا کرنے لگا۔
''ہے ماں۔ مجھ غریب کا بھی خیال کرو۔ میں بھوکوں مر رہا ہوں۔ کچھ تو مجھ پر بھی اپنی کرپا کرو۔''
یکا یک بجلی سی کوند پڑی اور اس کے سامنے دیوی ماں پرکٹ ہوئی۔
''ہے منشیہ، تم روز روز یہ کیا آہ وزاری کرتے رہتے ہو۔ میں نے تو تمہاری پرارتھنا سن کر زیوروں بھری تھیلی تمہارے سامنے رکھ دی تھی۔ پھر تم نے وہ کیوں لوٹا دی۔ میرے پاس کوئی ٹکسال تو ہے نہیں کہ سونے چاندی کے سکے بنا کر تمہارے گھر میں ان کی بارش کر دوں۔ میں ایک سے چھین لیتی ہوں اور دوسرے کی حاجت روا کرتی ہوں۔ یہی میرا طریقہ ہے۔ تم نے گھر میں آئی لکشمی کو خود ہی لات مار دی۔''

یہ کہہ کر دیوی ماں غائب ہوگئی۔ اور مہیشر ناتھ خیرہ آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔

اس بات کو گزرے ہوئے بہت عرصہ بیت گیا۔ البتہ میرے ذہن میں اس کہانی کے ہلکے ہلکے نقش باقی رہے۔ اس درمیان بدلے ہوئے حالات نے ہمارے خاندان کو متوسط طبقے کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ نہ زمینیں رہی تھیں اور نہ ہی ڈھور ڈنگر۔ گھر میں ہر طرف ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے اتنا کافی نہ تھا کہ پرماتما نے پتاجی کو بھی اپنے پاس بلالیا۔ ماں ان پڑھ تھی۔ گھر میں پانچ افراد کی دیکھ ریکھ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایک زیور بیچتی رہی اور خون کے آنسو پیتی رہی مگر بچوں کو کبھی پتاجی کی کمی محسوس ہونے نہ دی۔ بہر حال وہ ہر روز گھر میں دیوی ماں کی تصویر کے سامنے زار و قطار رویا کرتی اور ساتھ یہ دعا کرتی کہ اسے برے وقتوں کا سامنا کرنے کی ہمت عطا کرے۔

دریں اثنا میں نے بارہویں کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور مجھے ریجنل انجینئرنگ کالج اِلہ آباد میں الیکٹرانک انجینئرنگ کے لیے نامزد کیا گیا۔ فیس تو زیادہ نہیں تھی البتہ ہوسٹل میں رہنے کا خرچہ برداشت کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے آس ہی چھوڑ دی۔ اپنا غم غلط کرنے کے لیے میں سورج ڈھلتے ہی اپنے دوست کے گھر جایا کرتا اور دیر گئے واپس آجاتا۔

ایک رات اس کے گھر سے نکلتے ہی گلی میں مجھے ایک ریگزین کا بیگ ملا جسے میں نے ہوشیاری سے اٹھالیا اور اپنے گھر لے گیا۔ اس بیگ میں سے پچاس ہزار کے اِندرا وکاس پتر برآمد ہوئے جن کو دیکھ کر میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ مجھے اتنا تو علم تھا کہ نقدی کی مانند اِندرا وکاس پتروں کا مالک بھی وہی مانا جاتا ہے جس کے قبضے میں وہ ہوتے ہیں۔ باقی ماندہ کاغذات کی جانچ پڑتال کر کے میں نے وکاس پتر اور دیگر کاغذات واپس بیگ میں ڈال دیے اور اپنی الماری میں سنبھال کر رکھ دیے۔ یک لخت مجھے لسہ کاک کے وہ الفاظ یاد آئے کہ دیوی ماں ایک سے چھین کر دوسرے کی حاجت روا کرتی ہے۔

دوسرے روز جب میں اپنے دوست کے گھر پہنچا، وہاں ہر طرف ماتم سا چھایا ہوا تھا۔ میں نے حالات کی ٹوہ لی تو معلوم ہوا کہ اس کے چاچا نے صبح دم زہر کھانے کی ناکام کوشش کی تھی اور اب وہ اسپتال میں حیات و موت کی جنگ میں مبتلا تھا۔ سن کر مجھے تعجب ہوا۔ اس لیے دوست

سے وجہ پوچھ بیٹھا۔

''آخر زہر کھانے کی کوئی تو وجہ ہوگی؟''

''کیا بتاؤں یار۔ چاچا جی حال ہی میں ریٹائر ہو گئے۔ کل ہی آفس سے گریچوٹی مل گئی تھی۔ ساری رقم ڈاک خانے میں جمع کر کے اِندراوکاس پتر خرید لیے گھر میں دو غیر شادی شدہ بیٹیاں ہیں۔ ان ہی کے واسطے یہ رقم بچا کے رکھنا چاہتے تھے۔ جس بیگ میں وِکاس پتر رکھے تھے گھر لوٹتے وقت وہ بیگ سائیکل کے کیریئر پر سے کہیں گر گیا۔ بہت ڈھونڈا مگر کہیں بھی نہ ملا۔''

''بیگ کیسا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''معمولی سا کالے ریگزین کا ہینڈ بیگ تھا۔ چاچا جی ہمیشہ دفتر کے کاغذات اسی میں رکھا کرتے تھے۔''

''ڈاک خانے سے ڈوپلی کیٹ نہیں مل سکتے ہیں کیا؟'' میں نے اپنی دُبدھا ظاہر ہونے نہ دی۔

''نہیں یار، یہی تو رونا ہے۔ اِندراوکاس پتر بیئر ربانڈ ہوتے ہیں۔ جس کے ہاتھ لگ جائیں وہی ان کا مالک بن جاتا ہے۔ ان کے ڈوپلی کیٹ ایشو نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کے بھگتان پر روک لگائی جاسکتی ہے۔''

اس رات جب میں واپس گھر پہنچا میرا دروں کورو کھشیتر بن چکا تھا۔ ایک جانب مجھے پکا بھروسا تھا کہ دیوی ماں نے میری آہ وبکا سن کر میری خاطر یہ بیگ راستے میں گرا دیا تھا جبکہ دوسری جانب میرا ضمیر بغاوت پر آمادہ تھا اور بار بار کہہ رہا تھا۔

''کیا تم کسی لڑکی کو یتیم بنا کر انجینئر بننا چاہتے ہو؟ کیا ایک لڑکی کے سیندور کے عوض تمہیں یہ ڈگری لینا منظور ہوگا؟ دِھکار ہے تم پر......! اس دولت میں ان غریب مظلوموں کی آہیں ملی ہوں گی۔ مانا کہ تم انجینئر بن جاؤ گے مگر سوچ لو کیا تم اپنے آپ کو زندگی بھر اس گناہ کے لیے معاف کر پاؤ گے؟''

رات بھر میں انگاروں پر سلگتا رہا اور صبح ہوتے ہی بیگ لے کر اسپتال پہنچ گیا۔ دوست کے چاچا کو ہوش تو آچکا تھا مگر نقاہت ابھی بدستور چھائی ہوئی تھی۔ بیڈ کے سامنے اس کی بیوی اور دونوں بیٹیاں مجسم سوال بنی ہوئی کھڑی تھیں۔ اتفاق سے میرا دوست بھی وہیں پر موجود

تھا۔میں نے کالے ریگزین کا بیگ مریض کے سامنے رکھ دیا اور بڑے ہی مودبانہ لہجے میں گویا ہوا۔

''چاچا جی۔یہ رہا آپ کا بیگ۔دیکھ لیجیے اس میں آپ کے سبھی کاغذات ہیں یا نہیں۔یہ بیگ مجھے پرسوں رات گھر جاتے وقت گلی میں ملا تھا۔کل معلوم ہوا کہ یہ بیگ آپ کا ہے۔اس لیے لوٹانے آیا ہوں۔''

چاچا کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی بھر کی کمائی اسے واپس مل رہی ہے۔اس نے دونوں بازوؤں سے بیگ کو ایسے پکڑ لیا جیسے بچھڑی ہوئی محبوبہ سے گلے مل رہا ہو۔پھر اس نے بیگ میں رکھی ہوئی چیزوں کا معائنہ کر کے اپنی تسلی کر لی۔اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا۔

''بیٹا،تم نے میری لاج رکھ لی۔تم تو ایشور کے فرشتے معلوم ہوتے ہو۔ورنہ ہمارے خاندان کی ناک کٹ جاتی۔بھگوان تمہیں لمبی عمر اور سکھی جیون دے۔تمہاری ہر کامنا پوری کرے۔''اس کی بیوی نے نم آنکھوں سے مجھے آشیرواد دی۔

میرا دوست مسلسل مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

خود مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کبھی کبھی گھر آئی ہوئی لکشمی کو ٹھوکر مارنا بھی دانائی ہوتی ہے چاہے دیوی دیوتا ہمیں بیوقوف ہی کیوں نہ سمجھیں۔

میں نے چپ چاپ چاچا جی کے پیر چھو کر ان سے اجازت مانگی اور دھیرے دھیرے اسپتال سے باہر نکلا۔اسی روز میں نے مقامی ڈگری کالج میں بی ایس سی کا داخلہ فارم بھر دیا کیونکہ مجھے وشواس تھا کہ ایک راستہ بند ہو بھی جائے تو ہزاروں راستے خود بخود کھل جاتے ہیں۔

●□●

# تخلیق کا کرب

میرے پاس لکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔پچپن برس کی زندگی کچھ کم تو نہیں ہوتی۔لاکھوں کروڑوں لمحوں پر پھیلی یہ زندگی اور ہر لمحہ ایک نیا تجربہ۔ایک نیا حادثہ!

عجیب سی بات ہے کہ ہر شخص یہی سوچ کر چلتا ہے کہ ماضی میں جو کچھ اس کے ساتھ پیش آیا وہ کسی اور کے ساتھ پیش نہیں آیا ہوگا۔جب لوگ اس کی کہانی پڑھیں گے تو انہیں اچنبھا ہوگا۔وہ اس کی ہمت، دلیری، صبر اور تحمل کی داد دیں گے۔مجھے بھی انہی جذبات نے ہمیشہ مغلوب کیا ہے۔میرا ماننا ہے کہ میری زندگی ہمیشہ پر خطر اور جوکھم بھری رہی ہے اور خدا کی نعمتوں کا کنواں صرف میرے وقت سوکھ جاتا ہے۔

کیا تم میری کہانی پڑھو گے؟ میں بہت اضطراب میں ہوں۔دردِ زہ سے تڑپ رہی عورت کی طرح۔اب مجھ سے یہ بوجھ نہیں ڈھویا جا رہا ہے۔میرا سینہ پھٹ رہا ہے۔نالۂ دل بوئے گل کی مانند اپنے پیراہن کو چاک کرنے پر آمادہ ہے۔تخلیق کا کرب انسان کو پاگل بنا دیتا ہے۔یہ ایسی کسک ہے جو آنکھ بند ہو جانے کے بعد ہی ختم ہوتی ہے۔انسان اپنی الگ دنیا بسانا چاہتا ہے۔اپنے فکر کی دنیا۔اپنے تصور کی دنیا۔

آدھی رات کو جب کلاک بارہ ضربیں لگاتا ہے تو میرے شریر میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے قلم کو روک لیتا ہوں اور من میں سوچ لیتا ہوں کہ میں بھی کیسا پاگل ہوں۔لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر لمبی تان کر سو رہے ہیں جبکہ میں قلم گھِس رہا ہوں۔کیا ملتا ہے مجھے اس طرح رات رات بھر جاگتے رہنے سے اور یہ کہانیاں رقم کرنے سے؟ اختلاج قلب کے باوجود میں ڈاکٹروں کی ہدایات فراموش کرتا ہوں اور مسلسل اپنے کام میں جٹا رہتا ہوں۔

میرے اندر کی کہانی باہر نکلنے کی کوشش کر رہی ہے مگر گلے میں پھنسے ہوئے مچھلی کے کانٹے کی مانند نکلتی ہی نہیں۔اس کانٹے کی چبھن بہت اذیت ناک ہے۔بہر حال ایذا طلبی اب میری

طبیعت ثانی بن چکی ہے۔میرا قلم تو مجھ سے بھی ڈھیٹ ہے۔رات بھر گھسیٹتے رہنے کے باوجود تھکتا ہے نہ رکتا ہے۔کہانی لکھنا میرا دھرم ہے جیسے عبادت کرنا عابدوں کا دھرم ہے۔

اس کے باوجود میری کہانی کا کوئی خریدار نہیں۔آج کل کسی کے پاس وقت بھی نہیں ہے۔سب لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں۔زندگی کی ریس میں کھو چکے ہیں۔انہیں کہانی پڑھنا بے کار لگتا ہے۔دوسروں کے الجھیڑوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔وہ خود ارتکاز کے شکار ہو چکے ہیں۔اپنے اندر کے دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔باہر کے عالم سے بے زار ہو چکے ہیں۔کبھی کبھی جب وہ خواب سے جاگتے ہیں تو تھکے تھکے اور پٹے پٹے سے محسوس کرتے ہیں۔انہیں تفریح کی ضرورت ہے۔وہ خارجی دنیا کو اپنی تفریح کا سامان سمجھتے ہیں اور حسین اشیا سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں۔انہیں سنیما اور ٹی وی کی رنگینیاں بھاتی ہیں۔ڈسکو اور بار کی محفلیں مدہوش کرتی ہیں۔پھر وہ کالے حروف کے اس سمندر میں کیوں ڈبکی لگائیں۔

میری کہانی کی پہلی قسط ایک میگزین میں چھپ چکی ہے۔ایک بوڑھے بزرگ نے میری کہانی پڑھنا شروع کر دی ہے۔وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ گیا ہے۔کہانی پڑھتے پڑھتے نہ جانے وہ کہاں کھو جاتا ہے۔وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور میگزین الٹ کر اپنی جانگھ پر رکھ لیتا ہے۔شاید اپنی گلیوں، محلے اور شہر کو یاد کر لیتا ہے۔

اس کا شہر کبھی سوتا نہ تھا۔دن رات جاگتا تھا۔وہاں کی سڑکوں پر آٹھوں پہر تانگے، ٹھیلے اور رکشے چلتے تھے۔اس نے پہلی بار اسی شہر میں آدمی کو رکشا ٹھیلتے ہوئے دیکھا تھا جس پر ایک گوری میم بیٹھی ہوئی تھی۔رکشے والے کے پسینے بہہ رہے تھے اور دم پھول رہا تھا۔تب بھی وہ دوڑے جا رہا تھا۔اس کے ضمیر نے احتجاج کیا تھا اور اس دن کے بعد اس کے گیتوں میں لہو اور پسینے کی بو آنے لگی تھی۔اس نے کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت بھی حاصل کی تھی۔مگر وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اس نے بھی سمجھوتا کر لیا۔اس کے دل نے جواز پیش کیا تھا۔

''اس رکشے پر بیٹھنے سے انکار کر کے دراصل تم اس غریب کی پیٹ پر لات مار رہے ہو۔بھیک مانگنے سے تو بہتر ہے کہ خون پسینہ بہا کر روٹی کما لے''۔

''اس کے بعد وہ ہمیشہ اسی رکشے سے گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر جاتا اور ہر روز بیوی کی جھڑکیاں سنتا''۔

''اور کوئی سواری نہیں ملتی آپ کو۔اب تو بس بھی چلنے لگی ہے۔پندرہ منٹ میں پہنچادیتی ہے مگر آپ تو لکیر کے فقیر ہی رہیں گے''۔

گھر کے راستے پر بہت بڑا بازار تھا۔ ہفتے میں ایک دوبار وہ بازار سے پہلے ہی اتر جاتا اور پھر سودا سلف لے کر پیدل گھر چلا جاتا۔راستے میں کتابوں کی دو چار دوکانیں تھیں۔ان پر کافی بھیڑ لگی رہتی۔وہ بھی چند ایک کتابیں اور میگزین گھر لے جاتا اور پھر نکڑ کے حلوائی سے تازہ جلیبی اور گرم سموسے خرید لیتا۔پچیس سال بعد جب اس نے اپنے ایک قریبی قلمکار دوست سے اس بازار کے بارے میں اپنے خط میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ساری دوکانیں بند ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ بیوٹی پارلر اور میوزک کیسٹس کی دوکانیں کھل گئیں ہیں۔حلوائی کی دوکان اب باقاعدہ ریستوران میں تبدیل ہو چکی ہے۔اسے یقین ہی نہیں ہوا کہ شہر کے وسط میں ایسے بھیڑ بھاڑ والے علاقے میں بیوٹی پارلر اور کیسٹس کی دوکانیں کھل چکی ہوں گی۔

اس بازار سے تھوڑی دوری پر ایک اور بازار تھا جو دن سے زیادہ رات کو جگمگاتا۔جہاں حسن کی نمائش قمقموں کی روشنی میں ہوتی۔شہر کے رئیس اور اُمراء اس بازار میں گھوڑوں پر سوار اپنے خادموں کے ساتھ سورج غروب ہوتے ہی پہنچ جاتے۔کلاسیکی موسیقی اور ناچ گانے ہر جگہ ان کا استقبال کرتے۔ان بازاروں میں لوگ تہذیب سیکھنے آجاتے تھے، تنغّض کو دور کرنے کے لیے نہیں۔اسے وہ دن بار بار یاد آیا جب وہ جوانی کے دنوں میں چھپ چھپ کر ان اندھیری گلیوں میں گھستا تھا اور وہاں کا ماحول دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔

ہوم ورک ختم کر کے اس کی پوتی کمرے میں آئی اور ٹیلی ویژن آن کر کے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔وہی ساس اور بہو کی جھک جھک چل رہی تھی۔بہو تھی کہ ساس کا پتا صاف کرنے کے لئے نت نئی سازشیں کر رہی تھی۔وہ چاہتا تھا کہ پوتی سے ٹی وی بند کرنے کو کہہ دے مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

ٹی وی کی رنگینیاں کالے اکھشروں پر بھاری پڑ گئیں۔اس نے میری کہانی ادھوری ہی چھوڑ دی اور میگزین بند کر کے الماری میں پھینک دیا۔اس کے بعد وہ اس میگزین کو بھول گیا اور اس پر وقت کی دھول جمتی رہی۔

مجھے معلوم ہے میری کہانی پڑھنے کو کوئی تیار نہیں۔پھر بھی میں الفاظ کے انبار لگا

لیتا ہوں۔ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے کی قیمت تو چکانی ہی پڑے گی۔ الفاظ کے ساتھ کھیلنا میری مجبوری ہے۔ پاولوف کے کتے کی طرح الفاظ دیکھ کر میرے منہ سے رال ٹپکتی ہے۔ میرے داداجی نے مجھے سب سے پہلے جو فلسفے کی بات سمجھائی تھی وہ یہی تھی۔ دنیا سے پہلے اگر کچھ تھا تو وہ تھا 'ناد' یعنی آواز۔ یہ دنیا آواز سے ہی پیدا ہوئی۔ 'کُن فیکون'۔ آواز کے ذریعے تو لفظ ہی بولا جاتا ہے ناں۔ اس لیے انہوں نے مجھے لفظ کے ساتھ محبت کرنا سکھایا۔ اس دن کے بعد میں نے آدرشوں اور اعلیٰ قدروں کو سینے سے لگایا۔

جب میرا بیٹا جوان ہوا میں نے اپنے سنسکار اور اپنی وراثت اسے سونپنا چاہی۔ میں نے بڑی شفقت سے اسے کہا۔ '' بیٹے! میں نے عمر بھر ایمانداری اور شرافت کی روٹی کھائی ہے۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کوئی دھن دولت نہیں ہے۔ میری سب سے بڑی دولت تم ہو۔ میں ورثے میں صرف اپنے سنسکار تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ کیا معلوم کب سانس اکھڑ جائے۔ اپنی دو بہنوں کا خیال رکھنا۔ اگر میں زندہ نہ رہا تو ان کو پاکیزہ آنچل اوڑھ کر گھر سے وداع کرنا۔''

میرا بیٹا مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ سوچتا ہوگا کیسا باپ ہے۔ وراثت میں جائیداد دینے کے بدلے میرے کاندھوں پر بوجھ ڈال رہا ہے۔ وہ شرارت بھری مسکان لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اسے معلوم ہے کہ اس صارفی دنیا میں ہر شئے کی فیس ہے۔ قیمت ہے۔ استاد کی شفقت، نرس کی ہمدردی، ڈاکٹر کی تشخیص، یہاں تک کی ماں کی ممتا پر بھی پرائس ٹیگ لگا ہوا ہے۔ امریکی اثرات کے باعث ہر چیز کو تجارتی زاویے سے دیکھنا پڑتا ہے۔ دنیا نے بُدھ، عیسیٰ اور گاندھی پیدا کرنا بند کر دیا ہے۔ اب صرف بل گیٹس، امبانی اور عظیم پریم جی پیدا ہوتے ہیں۔ اب قلمکاروں کا فن بھی ڈالروں سے آنکا جاتا ہے، خیالوں سے نہیں۔

میں اپنی کہانی کی اگلی قسط لکھنے کے لیے بے قرار ہوں۔ میں اس کہانی کو اپنے اور قارئین کے درمیان پل بنانا چاہتا ہوں مگر یہ پُل سرمایے کے بغیر نہیں بن سکتا۔ پبلی شروں، ترقیاتی اداروں اور اکادمیوں نے صاف جواب دیا ہے کہ ہم نئے پل نہیں بناتے، صرف پرانے پلوں کی مرمت کرتے ہیں جن کی کوئی توریثی قیمت (Heritage Value) ہو۔ برانگیختہ ہو کر میں نے اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانا ترک کر دیا۔ میری بیوی نے دریا دلی کا مظاہرہ کر کے اپنا

استری دھن میرے سامنے رکھ دیا اور بولی۔

''آپ کے برسوں کی محنت میں ضائع ہونے نہیں دوں گی۔ یہ لیجیے اسے بیچ دیجیے۔ آپ اپنی دوسری کتاب کو خود ہی چھپوایئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کا یہ ناول شاہکار بن جائے گا''۔

مجھے قاری کی تلاش ہے جو میری کہانی پڑھ لے، میرے دل کی گہرائیوں میں اترے اور میرا ہمنوا بن جائے۔ مجھے دور دور تک کہیں کوئی بھی شخص نظر نہیں آتا۔ سبھی لوگ اپنے اپنے دائروں میں مقید ہیں۔ آخر میرا قاری ہے کہاں؟ غربت وافلاس کی دھول چاٹتا ہوا کرگھوں پر اپنی جوانی لٹا رہا ہے۔ موت کی مہیب سرنگوں میں کوئلہ تلاش رہا ہے۔ قالینوں کی راچھوں پر دھاگوں کے تار و پود پھیلا رہا ہے۔ کانسی کے برتن سانچوں میں ڈھال رہا ہے۔ یا پھر دھونکنی کی تال پر گرم لوہے پر ہتھوڑے برسا رہا ہے۔ بس اسی کو میری زبان سمجھ میں آرہی ہے مگر اس کے پاس فرصت ہے نہ چاہت۔ وہ عالم ہے نہ دانشور البتہ میری زبان سمجھ لیتا ہے۔ مجھے وی ایس نائپال، سلمان رشدی، وکرم سیٹھ اور ارُن دتی رائے پر رشک آرہا ہے کیونکہ ان کی زبان الگ ہے اور ان کے قارئین بھی الگ ہیں۔

میری حالت دیکھ کر میرے انجینئر بیٹے کو مجھ سے ہمدردی ہونے لگی ہے۔ ورثے میں ملا جراثیم اس کے سارے بدن میں سرایت کر چکا ہے اور شاید اسکے دماغ پر بھی حملہ آور ہو چکا ہے۔ اس نے انجینئرنگ چھوڑ کر میری زبان سیکھ لی ہے اور ترسیل کی کھائی کو پاٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ میری زبان میں غزلیں، نظمیں اور کہانیاں پڑھنے لگا ہے اور ان پر سنجیدگی سے تنقید بھی کرنے لگا ہے۔ وہ اب خود بھی کہانیاں لکھنے لگا ہے۔

بہر حال مجھے اب بھی قاری کی تلاش ہے۔

●□●

# [illegible] بارے میں

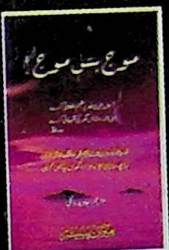


دیپک بد [illegible] کو سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ایم ایس سی (بوٹنی) اور بی ایڈ [illegible] مل کر کے انڈین پوسٹل سروس جوائن کرلی اور اب چیف پوسٹ [illegible] جنرل جے اینڈ کے سرکل کے عہدے پر فائز ہیں۔ (نوکری کے دوران انہوں نے گریجویشن، نیشنل ڈیفینس کالج دہلی (این ڈی سی) اور ایسوسی ایٹ انشورنش انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا ممبئی کے کورسز پاس کیے [illegible]۔ علاوہ ازیں انہوں نے ایکسپورٹ، ڈیولپمنٹ، منیجمنٹ، لائف انشورنس اور کمپیوٹر کے متعدد کور [illegible] میں بھی شرکت کی۔

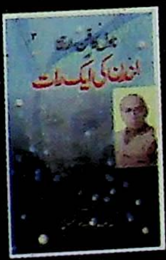
اردو ادب کے میدان میں دیپک بدکی 1970ء میں افسانہ سلمٰی لے کر اترے۔ 1976ء [illegible] بیس سال ذہنی تعطل کا شکار رہے اور اب 1996ء سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ساٹھ سے زائد افسانے [illegible] و غیر ملکی رسالوں می شائع ہو چکے ہیں۔ (ماہنامہ شاعر نے ستمبر 2004ء اور سہ ماہی انتساب سرونج [illegible] شمارہ نمبر 63 میں ان کے نام خصوصی گوشے وقف کیے۔ اب تک دیپک بدکی کے دو افسانوی مجموعے ادھورے چہرے (اردو/ ہندی ایڈیشن) اور چنار کے پنجے (اردو ایڈیشن) شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیف ''عصری تحریریں'' (تنقیدی مضامین وتبصرے) 2006ء میں منظر عام پر آ چکی ہے۔













MEEZAN PUBLISHERS
Opp. Fire Service Headquarters, Main Road, Batamaloo (J&K)
Phone : 0194-2470851, Fax : 0194-2457215 Cell : +91-9419002212